جامعہ مدنیہ لاہور کا علمی، دینی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

سرپرست

استاذ العلماء حضرۃ مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

لاہور

فون: ۶۲۹۳۲

قیمت: ۵۰ پیسے

مدیر اعزازی: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مدیر معاون: حبیب الرحمٰن اشرف

جلد: ۲ | رجب ۱۳۹۱ھ | ستمبر ۱۹۷۱ء | شمارہ: ۴

اس شمارے میں

اداریہ		۲
معراج رحمۃ للعالمین	حضرت مولانا سیّد محمد میاں مدظلہ	۷
نعت	پروفیسر رزمی صدیقی مرحوم	۲۳
اُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْن	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہ	۲۴
انوار صحابہ رضؓ	حضرت مولانا بشیر احمد پسروری	۳۸
حیات شیخ الاسلامؒ	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہ	۴۱
قصیدہ	حضرت مولانا عبدالمنان دہلوی	۴۳
اقتصادی اور سیاسی مسائل	حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہ	۴۶

پتہ: جامعہ مدنیہ ○ کریم پارک ○ راوی روڈ ○ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

کامیابی کی کنجی

الحمد للہ رب العلمین والصلاۃ والسلام علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد و الہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد خداوند کریم کی یاد ہی تمام کامیابیوں کی کنجی، ہر سعادت کی کامرانی ہے یہی انسان کو دنیا میں کامیاب تر بناتی ہے اور اخروی فلاح و کامرانی عطا کرتی ہے۔

ہمارے آج کل کے حالات میں قطعاً امن و جنگ کے درمیان غیر یقینی ہیں۔ اقتصادی مشکلات بدستور قائم ہیں اور پوری مملکت پریشان کی گردش ہے۔ ان تمام معاشی، مالی اور جسمانی نقصانات کی تلافی اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی کر سکتی ہے۔ تمام حالات کا رد و بدل اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ الصلاۃ والسلام نے جب ان کی قوم قحط و خشک سالی کی شکار تھی اور شامتِ اعمال کے باعث وہ نرینہ اولاد سے محروم تھے اور بانجھ پن کی بیماری عام تھی، ارشاد فرمایا:

استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمددکم باموال و بنین ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انہارا

(سورہ نوح پ: ۲۹، رکوع: ۹)

اپنے پروردگار سے اپنے گناہ بخشواؤ۔ یقیناً وہ ہمیشہ ہی مغفرت فرمانے والا رہا ہے۔ وہ تم پر آسمان کی دھاریں چھوڑ دے گا۔ اور تمہارے مال اور بیٹے بڑھا دے گا اور تمہارے باغ بنا دے گا اور نہریں بنا دے گا۔

گویا اس غذائی، اقتصادی بدحالی اور نسلی محرومی کا علاج یہی ہے کہ بندہ خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی بداعمالیوں سے تائب ہو۔

ہنگامی مشکلات، جہاد اور خوف کے وقت بھی خداوند کریم نے نماز پڑھنے اور اپنی یاد جاری رکھنے کا حکم فرمایا۔ ارشاد ہوا: فان خفتم فرجالا او رکبانا فاذا

پھر اگر تم کو کسی کا ڈر ہو تو پیدا وہ نماز پڑھو یا سوار۔ پھر جس

امنتم فاذکروا اللہ ۔ کما علمکم مالم تکونوا تعلمون (بقرہ پ ۲ ع ۵)

وقت تم امن پاؤ تو اللہ کو یاد کرو۔ جس طرح اس نے تم کو وہ سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

یعنی اگر لڑائی اور خوف کا وقت ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں سواری پر یا پیادہ بھی اشارہ سے نماز درست ہے۔ اگرچہ قبلہ کی طرف بھی منہ نہ ہو۔

پانچویں پارہ میں نماز خوف کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا گیا:

فاذا قضیتم الصلٰوۃ فاذکروا اللہ قیاما وقعودا وعلٰی جنوبکم فاذا اطمأننتم فاقیموا الصلٰوۃ ان الصلٰوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا۔

پھر جب تم (اس طریقے سے) نماز پڑھ چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔ پھر جب خوف جاتا رہے تو نماز کو ایسے مکمل طریقہ سے ادا کرو۔ بلاشبہ نماز مسلمانوں پر اپنے مقررہ وقتوں میں فرض ہے۔ (سورۂ نساء، پ ۵، رکوع ۱۲)

یعنی خوف کے وقت تنگی اور بے اطمینانی کی وجہ سے اگر نماز میں کسی طرح کی کوتاہی ہو گئی تو نماز خوف سے فراغت کے بعد ہر وقت اور ہر حالت میں کھڑے ہو یا بیٹھے یا لیٹے اللہ کو یاد کرو۔ حتّٰی کہ عین ہجوم اور مقاتلہ کے وقت بھی۔ کیونکہ وقت کی تعیین اور دیگر قیود کی پابندی تو نماز کی حالت میں تھی اور ان پابندیوں میں دشواری ہوتی تھی۔ اس کے سوا ہر حالت میں بلا وقت اللہ کو یاد کر سکتے ہو۔ کسی حالت میں اس کی یاد سے غافل نہ رہو۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صرف وہ شخص کہ جس کے عقل و حواس کسی وجہ سے قائم نہ رہیں، وہ تو معذور ہے، ورنہ کوئی شخص اللہ کی یاد نہ کرنے میں معذور نہیں۔

اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ ان حالات میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا عمل کیا ہے، جن کے دستِ مبارک میں تمام عالم کی کنجیاں بلکہ ہر دو عالم کی کامیابیاں ودیعت فرما دی گئی تھیں تو اس کے لیے یہی لائحہ عمل ملے گا۔

بلاشبہ اللہ بہترین ساتھی ہے۔ جو دنیا اور آخرت کا ساتھی ہے۔ جب سب چھوٹ جاتے ہیں تو وہ ہی قبر کو جنت بنا دیتا ہے۔ اور ہر طرح کی راحتِ دائمی عطاء کرتا ہے۔ وہ ہی بہترین مددگار ہے اسی سے سچی

اور سب سے زیادہ محبت رکھنی چاہیے اور اس کی یاد دل ہی دل میں ہر وقت قائم رکھنی چاہیے۔

راشد منہاس "نشانِ حیدر"

ہماری حکومت میں نشانِ حیدر وہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو خاص قربانی جوانمردی اور جاں نثاری جیسی فوجی خدمات دینے پر دیا جاتا ہے۔ پائلٹ راشد شہید سے پہلے بری فوج کے میجر طفیل، کیپٹن غلام سرور اور میجر عزیز بھٹی کو دیا گیا۔ یہ سب شہداء اس دنیا سے رخصت ہونے کے اس اعزاز سے نوازے گئے۔

اس اعزاز کو جس طرح ہم دنیا میں دیکھ رہے ہیں اللہ کے نزدیک یہ اعزاز ہر اس شہید کو دیا جاتا ہے جس نے اس کے نام پر جان دی ہو۔ اگر وہ طبعی امداد یا کسی قسم کا آرام و راحت بھی نہیں حاصل کر سکا ہے تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ اسے اسی طرح بغیر غسل دیے ہی دفن کر دیا جائے۔ گویا وہ بالکل پاک ہے۔ اس سے خدا کے یہاں سوال نہیں ہوگا۔ (سوائے اس کے کہ قرض دار ہو اور شہید ہوا ہو تو قرض کے بارے میں سوال ہو سکتا ہے۔) اس کی رُوح کا مسکن عرشِ الٰہی کے نیچے ہوتا ہے۔ اس کی رُوح کو جنّت میں جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ البتہ بدن سمیت داخلہ قیامت کے بعد ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

ان میں ہر اعزاز ایسا ہی ہے جیسے نشان حیدر ——— تقریباً دو سال ہوئے کہ حکومت نے مختلف محاذوں پر ۱۹۶۵ء کے شہداء کی قبور اٹھا کر منتقل کرنے کا حکم دیا۔ یہ ڈیوٹی بریگیڈیر ظفر علی خاں ہلالِ جرأت کے تحت انجام دی جا رہی تھی۔ جو میجر اس کام پر مامور تھے۔ وہ بہت نیک تھے خود بھی باوضو ہو کر اور قبر کھولنے والوں کو بھی وضو کرا کر قبر کھودنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ اکثر شہداء کا جسم صحیح و سلامت نکلا۔ کوئی کوئی شہید ایسا تھا کہ جس کا جسم سالم نہ رہا ہو۔

بہرحال یہ بھی ایک قسم کا اعزاز ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے انہیں عنایت ہوا۔ اور فوج میں کام کرنے والے بہت سے لوگ اس قسم کے واقعات کے شاید مل جائیں گے۔ یہ ہمارے لیے اس بات کا سبق ہے کہ ہم سب کو اخلاص کے ساتھ اللہ ہی کے لیے جان قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔

ایک استفتاء

محکمۂ اوقاف کی طرف سے ایک استفتاء موصول ہوا ہے جس میں یہ دریافت کیا گیا ہے کہ وطنیت بڑی چیز ہے یا اسلام اور اگر کہیں وطنیت اور اسلام کا تقابل ہو جائے، تو ان میں سے کسے ترجیح دی جائے، کیونکہ آج کل کے نوجوان وطنیت کو اسلام سے بڑی چیز سمجھنے لگے ہیں۔

یہ استفتاء کا مضمون ہے۔

اس کا جواب واضح ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب مکہ معظمہ میں اسلام کی مسلسل مخالفت اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے میں رکاوٹ کا ایک عرصہ تک سامنا کیا تو آپ کو حکم ہوا کہ وطن اور اقارب کو چھوڑ کر دوسرے مقام (مدینہ منورہ) ہجرت کر کے تشریف لے جائیں۔

یہی حال پورے عرب کا تھا کہ وہ ہر مسلمان کی انتہا درجہ مخالفت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ حکم تھا کہ جو بھی مسلمان ہو وہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر مدینہ منورہ ہجرت کر آئے۔ اس طرح سینکڑوں اوطان چھوڑ کر ہزاروں صحابہؓ مدینہ منورہ آ گئے اور اب بھی یہی حکم ہے کہ اگر کسی جگہ ارکانِ دین پر عمل نہ کیا جا سکتا ہو اور شعائر اللہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ہو تو وہاں سے ہجرت کرنی واجب ہوگی۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ وطن کا درجہ اسلام سے بہت نیچا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ وطن کی محبت کو شریعت نے ایک مقام دیا ہے، مگر اسلام سے بڑھ کر تو کیا برابر کا بھی نہیں دیا گیا۔

پچھلے سال گزشتہ انتخابی مہم میں وطنیت، جمہوریت اور عوام کے الفاظ بہت زیادہ استعمال ہوتے رہے۔ بڑے بڑے لیڈر یہی الفاظ دہراتے رہے، اس لیے تکرار سے تمام طلبہ کے ذہن میں انہی چیزوں کی اہمیت بڑھ گئی اور وہ بھی وطنیت کو مذہب سے جدا اور مقدم سمجھنے لگے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ان تک صحیح بات پہنچائی جائے اور دراصل سمجھانا ہی بہترین علاج ہے۔

مولانا عثمان صاحب مرحوم و مغفور

حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب رکنِ قومی اسمبلی کے بھائی مولانا محمد عثمان صاحب اچانک علیل ہوئے

اور کچھ روز بیمار رہ کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ نہایت صالح و متقی جوان تھے۔ ریاضت و مجاہدہ کے عادی تھے۔ حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی مدظلہم سے ان کو اجازتِ بیعت بھی حاصل تھی۔ گزشتہ سال ان کے ایک کمسن بچہ کا انتقال ہوا اور اس سال وہ خود دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مجھے رہ رہ کر ان کی تکالیف کا خیال آتا ہے۔ قارئینِ کرام سے استدعا ہے کہ ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفر لنا ولہ آمین

جامعہ مدنیہ لاہور

اِمسال جامعہ مدنیہ لاہور میں ایسے طلبہ ایک سو ساٹھ (۱۶۰) کے قریب ہیں، جو ملک کے مختلف صوبوں کے علاوہ برما، بدخشاں اور کشمیر وغیرہ سے آئے ہوئے ہیں۔ ان طلبہ کے مصارف خورد و نوش اور رہائش و تعلیم، تیمارداری اور دیگر ضروریات لباس وغیرہ بذمہ جامعہ ہیں۔ ان کے علاوہ مقامی بچوں سمیت تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد تقریباً پانچ سو ہے۔ ماہانہ مصارف مَطبخ و اساتذہ و عملہ آٹھ ہزار روپے ہیں۔ جامعہ کو اس وقت مالی مشکلات کا سامنا ہے۔ آپ حضرات سے استدعا ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ امداد فرما کر ماجور ہوں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجرَ المُحسِنِینَ۔

معراجِ سیّد المرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

اور

رُؤیتِ باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ

شواہد و دلائل — پُراسرار منظر اور تجلّیات

(۱)

شواہد و دلائل سعادت کے لیے اسی کو منتخب کیا جاتا ہے جو رموزِ مملکت سے واقف ہو ضروری چیزوں کا مشاہدہ کیے ہوئے ہو، اور اگر اس کو کسی خاص مشن پر بھیجا جائے تو یہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس مشن کا پورا جذبہ رکھتا ہو۔ اس کے متعلق پورا وثوق اور یقین اس کو حاصل ہو، جس کی بناء پر ہر بات قوّت سے کہہ سکے۔ پیچیدگیوں کو حل کر سکے اور اگر مشکلات پیش آئیں تو ان کو بھی برداشت کر سکے۔

یہی شان داعیانِ حق کی ہے جو ربِّ ذوالجلال کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے، وہ رموز و اسرار سے واقف تھے، مقصد پر پورا یقین رکھتے تھے، وقتاً فوقتاً ان کے یقینِ کامل میں جلا پیدا کیا جاتا تھا اور جس کی دعوت زیادہ وسیع اور ذمّہ داری زیادہ اہم ہوتی تھی، باوجودیکہ اس کا یقین زیادہ پختہ ہوتا اور اس کو اطمینان کامل اور شرح صدر حاصل ہوتا تھا، مگر پھر بھی غیر معمولی مشاہدات و تجلّیات سے ان کے شرح صدر اور اطمینان و یقین میں اضافہ کیا جاتا تھا۔

(۲)

نوعِ انسان کی ذہنی صلاحیّت جب اس حد پر پہنچی کہ اس نے اپنے مشاہدات سے نتائج اَخذ

کرنے شروع کئے تو اس نے ایک دھوکہ کھایا۔

آسمان کے تارے اور چاند سورج جو خالق کائنات قادر ذوالجلال کی قدرتِ بے پایاں کے نمونے، براہین اور آیات ہیں، انسان نے دھوکہ یہ کھایا کہ انہیں کو رب اور معبود سمجھنے لگا۔ اس نے یہ سمجھا کہ انہیں سے قربت حاصل کرنا کمال عبدیت ہے، وہ ان تک پہنچ نہیں سکتا تھا، تو ان کے نام کے ہیکل اور مندر بنائے اور ان کے گوشوں میں چلّہ کشی شروع کر دی۔

رب العلمین کے سب سے پہلے سفیر جنھوں نے نمونے اور اصل میں فرق کر کے یہ منصب العین معین کیا۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

میری نماز میری تمام عبادتیں میرا جینا اور میرا مرنا اس اللہ کے لیے ہے، جو رب العلمین ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے۔

آپ نے زہرہ پر نظر ڈالی، جو ایک ستارہ تھا، جس کی پرستش ان کے علاقہ میں خاص طور سے کی جاتی تھی۔ اس کو دیکھا کہ تھوڑی دیر وہ افق پر چمکتا رہا، پھر غروب ہو گیا تو طے کر لیا کہ جو ہستیاں ڈوب جانیوالی اور چھپ جانے والی ہیں، میں ان کا پرستار نہیں ہو سکتا، پھر پردۂ ظلمات کو چاک کرتے ہوئے چاند نمودار ہوا۔ پھر آفتابِ جہاں تاب جلوہ گر ہوا، وہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ روشن تھا، مگر جب دیکھا یہ سب کسی ٹھہرے ہوئے قاعدے کے پابند ہیں تو یقین کر لیا کہ جو پابند ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا اور طے کر لیا کہ

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

ترجمہ: میں نے سب طرف سے منہ موڑ کر صرف اس ہستی کی طرف اپنا رُخ کر لیا ہے جو کسی کی بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ خود آسمان اور زمین کی بنانے والی ہے اور میں ان میں سے نہیں ہوں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانیوالے ہیں۔

یہ ابتدائی مشاہدات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تھے، جن سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ قابل پرستش صرف ایک وہ ہے، جو ان سب پابند و قابل تغیّر چیزوں سے بالا ہے، جو ان سب کا خالق و مالک ہے، لیکن حضرت

ابراہیم علیہ السلام کو رشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ کے مقام اعلیٰ پر پہنچانا تھا، اس مقام اعلیٰ کے بموجب یقین کامل، شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا کرنا تھا تو اگرچہ تفصیل نہیں بتائی گئی مگر یہ بتا دیا گیا کہ:

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔ اس طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھا دیئے تاکہ وہ استدلال کر سکیں) اور یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائیں۔

حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم کو اسی دنیا میں جبکہ وہ ایک چٹان پر رونق افروز تھے۔ تمام آسمانوں کا عرش معلّٰے تک اور تمام زمینوں کا تحت الثریٰ تک نیز جنّت کا اور جنّت میں اُن کے مقام و موقف کا مشاہدہ کرا دیا گیا تھا۔ (امام التفسیر حضرت مجاہد و سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما)

(۳)

نوعِ انسان کا قافلہ آگے بڑھا۔ انفرادیّت کے بجائے اجتماعیّت پیدا ہوئی۔ سماجی نظام بنے، بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ امراء و وزراء رونما ہوئے، فوجیں منظم ہوئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ضابطۂ حیات اور ایک دستور دیا گیا، جس کا نام تورات ہے، جس کو بائبل کا عہدِ قدیم کہا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ترقی پذیر اجتماعی زندگی کے لیے دستور العمل عطا فرمانا مقصود تھا تو ان کی نبوّت و رسالت کا آغاز اس تجلّی سے ہوا، جو طور کی جانب وادی کے داہنے کنارے پر ہوئی تھی کہ ہرے بھرے درخت پر شعلہ بھڑک رہا تھا۔

جب وہاں پہنچتے ہیں، تو پکارا گیا ہے۔ اے موسیٰ میں ہوں تیرا پروردگار۔ بس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طُویٰ کی مقدّس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ میں نے تجھے اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے۔ بس جو کچھ وحی کی جاتی ہے۔ اُسے کان لگا کر سُن۔ میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ بس میری ہی بندگی کر اور میری ہی یاد کے لیے نماز قائم کر۔ (سورۃ طٰہٰ آیاۃ ۱۰ تا ۱۴)

اس تجلّی نے جس طرح یقینِ محکم میں اطمینان اور انشراحِ صدر کی روشنی پیدا کی۔ شوق کی ایک

چنگاری بھی قلبِ موسیٰ میں سلگا دی۔ یہ چنگاری دہکی اور جذبۂ شوق اس وقت اُبھرا، جب توریت عطا کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طُور پر بلایا گیا اور شرفِ مکالمہ سے نوازا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے یہ لطف و کرم دیکھا تو جرأت کر کے یہ درخواست بھی کر دی۔

رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ (میرے رب، میرے سامنے آجا، ایک نظر دیکھ لُوں تجھ کو) (سورۃ الاعراف)

جواب ملا، تُو مجھے نہیں دیکھ سکے گا، مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر یہ تجلّیٔ حق کی تاب لے آیا اور اپنی جگہ ٹکا رہا تو سمجھ لینا تجھے بھی میرے نظارے کی تاب ہے اور تُو مجھے دیکھ سکے گا۔

(سورۃ الاعراف آیۃ ۱۴۲)

بہرحال اس فرطِ شوق کا نتیجہ تو وہ بے ہوشی تھی جو حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام پر طاری ہوئی، جب تجلّیٔ رب سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا (سورۃ الاعراف آیۃ ۱۴۲)

مگر اس عجیب و غریب نظارے نے (جس میں تمنّائے دیدار بھی تھی اور اعلانِ لن ترانی کے ساتھ وُہ جلوہ آرائی بھی جس نے وارفتۂ شوق (حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو وارفتۂ حواس کر دیا) حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ایمانِ کامل اور آپ کے یقینِ محکم اطمینان و انشراح کے اس نورِ درخشاں سے بھی منوّر کر دیا، جو اُس عالی مرتبہ داعیِ حق کے لیے ضرُوری تھا، جس کو توریت کے وُہ الواح دیئے جا رہے تھے، جن میں ہر قسم کی باتیں لکھ دی تھیں، تاکہ (دین کے) ہر معاملہ کے لیے اس میں نصیحت ہو اور ہر بات الگ الگ واضح ہو جائے (سورۃ الاعراف آیۃ ۱۴۴)

ابتدائی اور درمیانی درجوں کے گزرنے کے بعد کمالِ اعلیٰ کی ضرُورت تھی۔ یہ کمالِ اعلیٰ نیز آخری پیغام یعنی کتاب مکمّل اور وہ کلام جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ کس کو عنایت ہوتا، وُہ اُسی کو دیا جاتا، جس کا یقین سب سے زیادہ محکم ہوتا، جس کو سب سے زیادہ شرح صدر حاصل ہوتا جس کے مشاہدات سب سے زیادہ وسیع اور سب سے اعلیٰ ہوتے۔ جس کے جذبۂ شوق کو "لن ترانی" کی نامرادی نصیب نہ ہوتی بلکہ :-

دنیٰ فتدلّٰی اور مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔

کی کامیابیاں بھی اس کو حاصل ہونے والی ہوتیں۔ قدرت نے یہ مرتبۂ بلند اس کے لیے تجویز کر رکھا تھا جس کا وجود اس کائنات کے خلق کا محرّک اور جس کا ظہور مقدّس اس پورے نظامِ عالم کا آخری مقصد تھا۔

لولاک لما خلقت الافلاک۔

(اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) اگر تو نہ ہوتا تو عالم کون و ہست کی یہ صورت گری بھی نہ ہوتی)

اعلیٰ مشاہدات کی تفصیل معلوم کرنی ہو تو سورہ "والنجم" کی تلاوت کیجیے۔

معراج کا پُراسرار منظر اور تجلّیات

اس اکمل الانبیاء اور اکمل الرّسل کے مشاہدات کی تفصیل سورہ "والنّجم" کی ابتدائی آیات میں بیان کی گئی ہے۔ لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

"قسم ہے تارے کی، جب گرے (غروب ہو) بہکا نہیں تمہارا رفیق اور بے راہ نہیں چلا۔ نہیں بولتا اپنے دل کی چاہ (خواہش) سے جو کچھ ہے وہ وحی ہے، جو اس پر اتاری جاتی ہے۔ سکھایا اس کو سخت قوّتوں والے نے۔ زور آور نے۔ پھر متمکن ہوا (قائم ہوا) وہ تھا افقِ اعلیٰ پر۔ پھر نزدیک ہوا، پھر اور قریب ہوا (لٹک گیا) پھر رہ گیا فرق دو کمانوں کا میانہ۔ یا اس سے بھی زیادہ نزدیک (دو کمانوں کی برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اُس سے بھی کم) پھر وحی کی نازل اپنے بندے پر، جو وحی نازل کی (پھر حکم بھیجا اپنے بندے پر جو بھیجا) جھوٹ نہ دیکھا دل نے جو دیکھا۔ اب کیا تم اس سے جھگڑتے ہو۔ اس پر جو اُس نے دیکھا اور بیشک دیکھ چکا تھا، وہ اس کو ایک دُوسرے نزول (اتارنے) میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس کے قریب جنّت الماویٰ ہے، جب چھا رہا تھا اُس سدرۃ المنتہیٰ پر جو چھا رہا تھا اور تھکی (مڑی) نہیں نگاہ۔ نہ حد سے بڑھی۔ بیشک دیکھے اُس نے

اپنے رب کے بڑے نمونے (بڑے بڑے عجائبات)

تفہیمات و تلویحات

(۱) استاد محترم حضرت علامہ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ پراسرار منظر جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے۔ وہ منظر "معراج" ہے۔ صاحبِ تفسیر مظہری حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی یہی ہے۔

(ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ النجم)

سطور بالا کا ترجمہ لفظی ہم نے پیش کر دیا۔ شاید آپ کو ابہام و اجمال کی شکایت ہو۔ یہ شکایت بجا ہوگی بیشک مجمل اور مبہم ہے۔ مگر اسرار و رموز میں تفصیل کب ہوا کرتی ہے۔ عشق و محبت کی باتیں تو مبہم ہی ہوا کرتی ہیں یہاں پردہ داری ہی میں لطف ہوتا ہے۔ ع

دیدار مے نمائی و پرہیز مے کنی

پھر یہاں تو عشق و محبت کے ساتھ عابد و معبود کا رشتہ بھی ہے اور تذکرہ اس بارگاہ اور اس مقام اعلیٰ کا ہے۔ جہاں پرواز فکر کے بھی پر جلتے ہیں اور اس سے بہت دور سے جبرئیل امین نے کہہ دیا تھا ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغ تجلّی بسوزد پرم

ہم مادے کے گھروندے میں بند ہیں۔ ہمارا قیاس ہمارا خیال ہمارا علم غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے۔ اس کا دائرہ اس گھروندے سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور جس کے ماحول کا تذکرہ ہے، وہ مادے سے بہت بہت مقدس۔ بہت پاک ؎

اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

پس جب اس برتر و بالا کی باتیں ہوں گی تو لامحالہ ان میں اجمال ہی ہوگا۔ ہمارے ناقص الفاظ میں تفصیل کی گنجائش کہاں ہے اور یہ بھی اُس وقت جب ہمارے ناقص الفاظ استعمال کیے جائیں اور اگر وہاں کے الفاظ بولے جائیں تو ہم اتنا بھی نہ کہہ سکیں، شاید یہ مقطعات قرآنی یعنی الٓمٓ - حٰمٓ - الٓرٰ وغیرہ وہاں

کی زبان کے الفاظ ہیں جن کے سمجھنے سے فہم انسان قاصر ہے اور حضرات مفسرین یہی کہہ دیتے ہیں: اللہ اعلم بمرادہ۔

(۲) دیدار نہ ہوسکنا، کھلی ہوئی بات تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دو لفظوں میں کہہ دی گئی "لن ترانی" تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، مگر یہاں فرمایا گیا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی نہ نگاہ مڑی، نہ حد سے آگے بڑھی،

اس سے پہلے فرمایا گیا ہے۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔ جھوٹ نہ دیکھا دل نے جو دیکھا۔

اور اگر کذّب والی قرأت لی جائے (ذال پر تشدید) تو مطلب یہ ہے کہ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس کی تصدیق کی۔ تکذیب نہیں کی۔

مگر کیا دیکھا۔ ایک تر تبہ اور دیکھا، کس کو دیکھا۔ وہ سخت قوتوں والا زور آور کون ہے، جس کا تذکرہ پہلے ہوا۔ کیا دل بھی دیکھتا ہے۔ دل کی آنکھوں نے کیا دیکھا۔ دیدۂ چشم سے کیا نظر آیا۔ قائم کون ہوا۔ اُفق اعلیٰ پر کون تھا، اللہ میاں تھا، وہ تو لامکاں ہے، پھر اُفق اعلےٰ پر کیسے۔ قریب کون ہوا۔ تدلّی کس کی ہوئی۔ وحی کس نے بھیجی۔

دیکھو یہ بارگاہِ عشق ہے۔ نہیں۔ دربار ربِّ ذوالجلال ہے، جو کچھ کہو، سوچ کر کہو۔ سمجھ کر کہو۔ ادب شرط ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

فضلائے امّت اور اکابر علماء (رحمہم اللہ) دم بخود ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی باتیں بھی مختلف ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبد کامل (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مقصودِ حقیقی کا دیدار ہوا۔ یعنی اہل ایمان تجرد کے جس اعلےٰ مقام پر قیامت کے بعد پہنچیں گے۔ جب وہ ربِّ حقیقی کا جلوہ اس طرح دیکھیں گے۔ جس طرح چودھویں رات کا چاند بے حجابانہ نظر آتا ہے۔ محبوب ربّ العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم

شبِ معراج میں کچھ ایسے ہی درجہ پر تھے۔ ممکن ہے آپ کا درجہ اس سے بھی بلند ہو۔ بس یہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے یہی حبیبِ خدا ہیں (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ربِّ ذوالجلال نے یہ کمال آپ کو عطا فرمایا ہے۔

جبرئیل امین (علیہ السلام) کو اس طرح دیکھنا، اس محبوب ربّ العٰلمین (صلی اللہ علیہ وسلّم) کیلئے کمال نہیں ہے۔ جس کے متعلّق عقیدہ یہ ہے کہ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہّ مختصر

اور مارأیٰ سے پہلے ماکذّب الفواد کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جس دیدار کا شرف حاصل ہوا ہے، وُہ دیدار ربّ العٰلمین ہو۔

دیکھنے والے کی آنکھ نے آفتاب نیم روز کو دیکھا، اس کے لیے دِل کی تصدیق درکار نہیں ہے۔ آنکھ دیکھ رہی ہے۔ دل تابع ہے۔ دِل نہیں مانتا تو ہٹ دھرم ہے۔ کیونکہ آفتاب کو دیکھنا آنکھ ہی کا کام ہے۔ لیکن وُہ امور قدسیہ جن کا تعلّق حضرت جل مجدہ کی ذات وصفات سے ہو۔ اُن کا روشن دان قلب ہے۔ ربِّ اکبر کا تجلّی گاہ قلب مومن ہی ہوتا ہے۔ یہاں آنکھ تابع ہے۔ شیطانی چمک دمک اور تجلّیاتِ رحمانی میں فرق کرنا قلب ہی کا کام ہے۔ لہٰذا ماکذّب الفواد کی سند کی ضرورت اُسی وقت ہوتی ہے، جب دیدۂ چشم نے نورِ حق کا نظارہ کیا ہو۔

شدید القویٰ ذومرّہ کون ہے

شاید خلجان ہو کہ سخت قوّتوں والا زور آور یعنی شدید القویٰ ذومرّہ حضرت حق جل مجدہ کی شان کے شایان نہیں ہے۔ ان الفاظ میں مادّیت کی بُو آتی ہے، لہٰذا حضرت جبرئیل امین علیہ السّلام کے لیے تو برداشت ہو سکتے ہیں۔ خود قرآن شریف میں سورۂ تکویر میں حضرت جبرئیل علیہ السّلام کو ذی قوّت فرمایا گیا ہے۔ مگر حضرت جل مجدہ کی شان اعلیٰ وارفع کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اسی طرح فاستویٰ۔ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے متمکن ہُوا۔ قائم ہُوا۔

اور حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔ سیدھا بیٹھا، اسی طرح یہ باتیں کہ پھر نزدیک ہوا۔ پھر اور قریب ہُوا۔ پھر رہ گیا فرق دو کمانوں کا میانہ۔ یا اس سے بھی نزدیک

(دو کمانوں کی برابر فاصلہ رہ گیا، بلکہ اور بھی کم) یعنی ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی

جس کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر نے یہ فرمایا ہے "پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا" پھر رہ گیا فرق دو کمان کا میانہ یا اس سے بھی نزدیک" یہ تمام کیفیتیں حضرت حق جل مجدہ کی شان کے مناسب نہیں ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے :۔

پھر وہ فرشتہ نزدیک آیا۔ پھر اور نزدیک آیا۔ سو دو کمانوں کی برابر کا فاصلہ رہ گیا، بلکہ اور بھی کم"

جواب بیشک یہ خلجان بجا اور برمحل ہے مگر ہم اس مضمون میں پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں اور اب پھر اقرار کرتے ہیں کہ ہماری لغت (اردو ہو یا فارسی یا عربی یا کوئی اور زبان) بہت قاصر ہے۔ ہمارے علم۔ قیاس، خیال۔ غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کا دائرہ ہمارے محسوسات اور اپنے ماحول کے تعلقات سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لہذا ہمارے ذخیرۂ لغت میں صرف انھیں مادیات کے لیے کچھ الفاظ ہیں۔ اس بناء پر وہ حقائق جو نہ عام محسوساتِ انسانی کی حدود میں داخل ہیں۔ نہ ہمارے تصور و تخیل کے احاطہ کے اندر ہیں۔ ہمارے الفاظ ان کو ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کر سکتے۔ مگر چونکہ سمجھانا بہرحال ان ہی الفاظ سے ہے تو یہی ناقص الفاظ اُن حقائق قدسیہ کے لیے مستعار لیے جاتے ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے اس استفادہ کے لیے شرط یہ ہوتی ہے کہ صاحب الشرع نے ان الفاظ کو اس مفہوم کے لیے استعمال کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی شان میں بارئ النسمۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن اللہ تعالےٰ کو مولد النسمہ نہیں کہہ سکتے، حالانکہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے (جان کا پیدا کرنے والا) عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کے لیے ضابطہ یہ ہے کہ جو الفاظ حضرت حق جل مجدہ کے لیے استعمال کئے جائیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ باعظمت ہوں، جن میں کسی نقص کا وہم بھی نہ ہوتا ہو۔ وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ۔

(ارشاد ربانی ہے۔ وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا وذروا الذین یلحدون فی اسما

(سورۃ الاعراف)

اب جو الفاظ ان آیات میں استعمال کئے گئے ہیں۔ وہ اگر محاورہ شریعت میں حضرت حق کیلئے

استعمال کیے جاتے ہیں۔ تو ہمیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کہ ہم ان الفاظ سے ذات حق جل مجدہ یا اس کا کوئی وصف مراد لیں۔

اس اصول کے پیش نظر ملاحظہ فرمائیے۔ سورۃ الذاریات میں ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔

یعنی اللہ تعالےٰ کے لیے قوت والے کا لفظ وارد ہوا ہے۔

سورۃ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

سورۃ الاعراف۔ سورۃ رعد۔ سورۃ فرقان وغیرہ میں ارشاد ہوا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔

یعنی استویٰ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں موجود ہے۔

مرّۃ کے معنی ہیں، قوت۔ مضبوطی (قاموس)

ذو مرة۔ کانہ محکم الفتل (المفردات فی غرائب القرآن)

ذو مرة۔ کا لفظ اگرچہ قرآن حکیم میں اسی مقام پر وارد ہوا ہے، لیکن اسی مفہوم کو ادا کرنے والا لفظ شدید البطش محاورات شریعت میں وارد ہے۔

سورۃ اخدود میں ہے:۔ ان بطش ربك لشديد

البتہ یہ ظاہر ہے کہ الفاظ اگرچہ وہی ہیں، مگر ان کی کیفیت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ خود ہماری محسوس اور دیکھی بھالی چیزوں میں لفظ ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر مختلف چیزوں کے لحاظ سے اس کی کیفیت مختلف ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً بیٹھنا ایک لفظ ہے۔ مگر آدمی بیٹھ گیا۔ پودا بیٹھ گیا۔ کاروبار بیٹھ گیا۔ عمارت بیٹھ گئی۔ دل بیٹھ گیا۔ یا مثلاً اڑنا۔ پرندہ اڑ گیا۔ جہاز اڑا۔ جوتی اڑ گئی (چوری ہوگئی) دماغ اڑ گیا۔ (حواس باختہ ہوگیا) دل اُڑا جا رہا ہے (اختلاج ہو رہا ہے) آیت زیر بحث میں استویٰ کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ سیدھا بیٹھا۔ تدلّٰی کا ترجمہ کیا ہے: لٹک آیا۔ اب اس کا تعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہو یا اللہ رب العزت سے۔ ظاہر ہے بیٹھنے یا لٹکنے کی وہ نوعیت نہیں ہوگی، جو کسی انسان یا کسی محسوس چیز کی نسبت سے ہمارے ذہن میں آتی ہے کیونکہ جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضرت جبرائیل اس موقع پر اپنی اصلی ہیئت میں نمودار ہوتے تھے۔

کہ اُن کے چھ سو بازو تھے اور آسمان کے تمام کناروں (افق) کو گھیر رکھا تھا۔ ظاہر ہے ایسی ہستی کا بیٹھنا یا لٹکنا ہمارے عام تصوّر کے بموجب نہیں ہوگا۔ یہی تاویل کرنی پڑے گی کہ بیٹھنے یا لٹکنے سے ایک خاص ہیئت مراد ہے۔ جو جبرئیل امین علیہ السلام کی ہیئت اصلیہ کے مناسب ہے۔ جب تاویل کی ضرورت یہاں بھی ہے، تو پھر وہ بلند معنی کیوں نہ لیے جائیں کہ ان افعال کی نسبت اللہ تعالےٰ کی جانب ہے اور استواء۔ قوۃ اور مرّۃ سے وہ مفہوم مراد ہے۔ جو حضرت جل مجدہ کی شان کے مناسب ہو۔ جس کی کوئی تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ اُس کی مثل کوئی چیز نہیں (لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ)

دنیٰ فتدلّیٰ

رہ گئے یہ الفاظ دنیٰ۔ فتدلّیٰ۔ فکان قاب قوسین اَوْ ادنیٰ۔ تو ان کا جو ترجمہ کیا گیا، وُہ لغتِ عربی کے لحاظ سے صحیح ہے، مگر اربابِ طریقت اور اہلِ سلوک کے محاورہ میں یہ تقرب الی اللہ کے مراتب ہیں۔ اہلِ تصوّف صرف الفاظ ہی سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے بموجب ان مراتب اور درجات تک رسائی حاصل کرتے ہیں، جو ان الفاظ سے اصطلاحًا مراد ہوتے ہیں۔

اگرچہ ظاہر ہے، سرورِ کائنات سید موجودات محبوب رب العٰلمین کی رسائی میں اور صوفی کی رسائی میں زمین آسمان بلکہ اس سے بھی زیادہ کا فرق ہوگا، لیکن اگر آپ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی نماز کو صلوٰۃ کہتے ہیں اور یہی لفظ آپ گنہگار۔ فاجر وفاسق کی نماز کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کو شریعت کا محاورہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی نمازوں میں اتنا فرق ہے کہ اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرات اہلِ تصوف اور اربابِ طریقت کی اصطلاحات کو بھی شرعی اصطلاحات نہ قرار دیں، اور لٹکنے کے بجائے "تدلّی" کے وُہ درجہ مراد نہ لیں جو اہلِ طریقت کی اصطلاح میں مراد ہوتا ہے۔

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

ومراتب الدنو والتدلی اوبما کنی بقاب قوسین اوبما هو ادنیٰ منه درجات قرب للعبد من الله تعالیٰ فی تجلیاته سبحانه یدرکه الصوفی ومن یذق لم یدر وقد ذکروا هذه الدرجات فی کتب التصوف فی کلماتهم اکثرها (تفسیر مظہری صفحہ ۱۰۰ ج ۹)

دنو (قریب ہونا) تدلّی اوقاب قوسین اوادنیٰ منہ تقرب الی اللہ (قربت خداوندی) اور تجلّیاتِ خداوندی کے درجات ہیں جنکو صوفی جانتا ہے اور پہچانتا ہے، مگر جس کو یہ ذوق ہی نہ ہو

وُہ ان درجات کو پہچان ہی نہیں سکتا اور حضرات اہل تصوف کے اپنے ملفوظات میں ان کا تذکرہ اتنی مرتبہ کیا ہے کہ اس کی کوئی گنتی نہیں ہو سکتی۔

وہو بالافق الاعلیٰ اس تفسیر کے لحاظ سے اس آیت کا مصداق بھی معیّن ہو گیا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:۔ "وُہ تھا افق اعلیٰ پر" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی استعداد اور صلاحیت کے سب سے بلند مرتبہ پر تھے۔ پھر دنو۔ تدلّی اور قاب قوسین کے مراتب پر فائز ہُوئے۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شاعرانہ زبان میں اس بلند ترین مقام کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔

شبے برنشست از فلک برگزشت　　تمکین و جاہ از ملک درگزشت
چناں گرم در تیہ قربت براند　　کہ در سدرہ جبرئیل از و باز ماند
بدو گفت سالار بیت الحرام　　کہ اے حامل وحی برتر خرام
چو در دوستی مخلصم یافتی　　عنانم ز صحبت چرا تافتی
بگفتا فرو تر مجالم نماند　　بماندم کہ نیروے بالا نماند
اگر یک سر موئے برتر پرم　　فروغ تجلّی بسوزد پرم

حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری لیلۃ المعراج کی تصویر کھینچ دی ہے، فرماتے ہیں۔

ترجمہ: (۱) ایک شب کو (براق پر) بیٹھے آسمان سے اوپر پہنچ گئے اور اپنے قدر و منزلت میں فرشتے سے بھی آگے بڑھ گئے۔

(۲)۔ قربت خداوندی کی وادی میں اتنے تیز چلے کہ جبرئیل امین بھی سدرۃ المنتہیٰ پر ان سے پیچھے رہ گئے۔

(۳)۔ بیت الحرام کے سردار (آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) نے جبرئیل امین علیہ السّلام سے فرمایا: اے وحیٔ خداوندی کے پہنچانے والے اوپر تشریف لائیے۔

(۴)۔ جب تم نے مجھے دوستی میں مخلص پایا ہے، تو یہاں میری معیت سے کیوں باگ موڑلی ہے

(۵)۔ حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: میری مجال نہیں کہ اس سے اُوپر پہنچ سکوں، مَیں اس لیے یہاں

رہ گیا کہ میرے پر دل میں پرواز کی طاقت ہی نہیں رہی۔

(۶) اگر ایک بال کی برابر بھی اوپر اُڑوں تو تجلّی کی روشنی میرے پروں کو جلا ڈالے۔

فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ

شدید القویٰ ذومرۃ فاستویٰ (تا ادنیٰ) کے متعلق جو خلجان پیش کیا گیا۔ وہ اپنی جگہ دُرست تھا۔ اسی لیے اس کا جواب دیا گیا، لیکن اس جواب کے بعد خلجان پیش کرنے والے حضرات کی توجہ اس طرف بھی منعطف کرانی ہے کہ اگر شدید القویٰ سے مراد جبرئیل امین ہو اور اس کے بعد کی تمام کیفیات کا تعلق حضرت جبرئیل سے قرار دیا جائے تو کیا اس سلسلہ کلام کی آخری آیت فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ (وحی نازل کی اپنے بندہ پر جو وحی نازل کی) کا تعلق بھی حضرت جبرئیل ہی سے ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم بندے کس کے ہیں۔ وحی نازل کرنے والے کون ہیں؟ اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے کہ اس آیت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندہ پر جو چاہی وحی نازل کی۔

جب اس آیت کا تعلق اللہ تعالےٰ سے ہے۔ تو سابق آیات اور اوصاف کا تعلق بھی اللہ ہی سے ہوگا یعنی ماننا پڑے گا کہ جو خدا سکھانے والا ہے، جو ذوالقوۃ المتین ہے، جو عرش پر متمکن ہے۔ جس نے وحی نازل کی وہی ہے، جس کا دیدار دیدہ چشم نے کیا، جس کی تصدیق قلب نے کی، جو اس دیدار میں شریک چشم تھا۔

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر یہ معنی لیے جاتے کہ فرشتہ نزدیک آیا۔ پھر اور قریب آیا، یہاں تک کہ تقریباً دو کمانوں کی برابر فاصلہ رہ گیا، بلکہ اور بھی کم۔ تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا کمال نہیں ظاہر ہوتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو حضرت جبرئیل سے افضل تسلیم کیا گیا ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

وزیرای فی السماء جبرئیل ومیکائیل۔

ترجمہ: آسمان میں میرے دو وزیر جبرئیل و میکائیل ہیں۔

لاتدرکہ الابصار

ہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف میں ہے:۔

لا تدرکہ الابصار۔ ("نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں")

تو حضرت حق جل مجدہ کی رویت کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ ادراک اور دیدار (رویت) میں فرق ہے۔

چاند سورج پر ہماری نظر پڑتی ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے چاند دیکھا، یعنی ہمیں چاند و آفتاب کی رویت ہوئی، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے چاند سورج کا ادراک کر لیا۔ کیونکہ ادراک اسی وقت بولا جاتا ہے جب پوری چیز پر نظر پڑ جائے اور اس کی کچھ حقیقت بھی معلوم ہو جائے۔

الادراک ھو الوقوف علی کنہ الشیء والاحاطہ او الوصول الی الشیء بحیث لا یفوت منہ الشیء۔

رویت اور ادراک کا فرق اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

بنو اسرائیل رات کی اندھیری میں مصر سے روانہ ہو گئے فرعون کو جیسے ہی خبر پہنچی - دن نکلتے ہی فوج لیکر ان کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ دونوں جمعیتوں نے (لشکروں اور بنو اسرائیل) نے جب ایک دوسرے کو دیکھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا "انا لمدرکون" ہم تو پکڑ لیے گئے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے "تراءی" لایا گیا ہے، جو رویت سے ماخوذ ہے، اور جب بنو اسرائیل کو احساس ہوا کہ ہم سب طرف سے گھر گئے ہیں تو اس کے لیے "مدرکون" لایا گیا ہے، جو ادراک سے ماخوذ ہے۔

"مدرکون" کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے کیا ہے۔

ہم تو پکڑ لیے گئے" - پس ادراک ایسے موقعہ پر بولا جائے گا۔ جہاں احاطہ اور کشفِ حقیقت کی شان ہو۔

نُورٌ اَنّٰی اَرَاہُ نور ہے، کہاں دیکھ سکتا ہوں

اس موقعہ پر یہ واضح کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ رویت کا اطلاق ایسے موقعہ پر بھی ہوتا ہے، جہاں ادراک، یعنی انکشاف حقیقت کا مفہوم مقصود ہو۔ جہاں رویت سے انکار کیا گیا ہے۔ وہاں رویت کا یہی مفہوم مراد ہے (جو ادراک کا ایک درجہ ہے)

مثلاً حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رویت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے جواب دیا۔

نورٌ انّیٰ اَرَاہُ (نور ہے، مَیں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں)

جہاں تک نُور کا تعلق ہے، وہ نظر آنے کے قابل چیز ہے۔ اس کے لیے۔

انّی اراہ نہیں کہا جا سکتا۔ (میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہُوں)

البتہ ادراک کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہاں ادراک کر سکتا ہوں۔

پس اس ارشادِ گرامی میں اگرچہ بظاہر انکار ہے، مگر اس انکار میں اقرار بھی ہے، کیونکہ ظاہر ہے، کچھ تو نظر آیا۔ جب ہی تو ارشاد ہُوا " نورٌ "

مگر جہاں تک حقیقت نور کا تعلق ہے، تو اس کے ادراک سے عقل سراسر قاصر۔ نظر و فکر معطّل اور نگاہیں خیرہ ہیں (کما قیل)

دُور بینانِ بارگاہ الست جز ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

دُوسری توجیہہ

اس طویل بحث کا حاصل یہی ہے کہ شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدۂ چشم سے حضرت حق جلّ مجدہ کی رویت ہُوئی۔ حضرت ابن عبّاس رضی اللہ عنہما کا مسلک یہی ہے۔

مگر دُوسرا مسلک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے، جو حضرت حق جل مجدہ کی رویت کو ناممکن قرار دیتی ہیں۔ وُہ پُورے وثوق اور بڑی پختگی سے فرماتی ہیں کہ شب معراج میں اللہ تعالےٰ عزوجل کی۔ رویت نہیں ہوئی شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السّلام کو اپنی اصلی ہیئت میں دیکھا تھا۔ سورہ نجم میں اسی رویت کا تذکرہ ہے۔

قریب ہُوئے زیادہ قریب ہُوئے، حتیٰ کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم۔

یہ سب حضرت جبرئیل علیہ السّلام سے متعلّق ہیں۔

یہ حقیقت بھی یہاں واضح کر دینی مناسب ہے کہ عمُوماً حضرات مفسرین نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ اردو زبان میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان میں بھی اسی کی اتباع کی گئی ہے۔ اس لیے اس موقع پر اس توجیہہ کی تفصیل کے بجائے یہ مشورہ دینا کافی معلوُم ہوتا ہے کہ صاحبِ ذوق حضرات تفسیر بیان القرآن مصنّفہ

حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ مطالعہ فرمائیں۔ حکیم الامّت رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسلک کی بہترین ترجمانی کی ہے۔

لطیفہ لطف کی بات یہ ہے کہ گزشتہ صدی کے علامہ محقق سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ اپنی مشہور تصنیف رُوح المعانی میں فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ محض تعبیر اور الفاظ کا اختلاف ہے، جس کو اختلاف لفظی کہا جا سکتا ہے۔

استادِ محترم حضرت علاّمہ مولانا شبّیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کی تائید فرماتے ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں "معلوم ہوا کہ خداوند قدوس کی تجلّیات و انوار متفاوت ہیں۔ بعض انوار قاہرہ للبصر ہیں۔ بعض نہیں۔ اور رویت رب فی الجملہ دونوں درجوں پر صادق آتی ہے۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ جس درجہ کی رویت مومنین کو آخرت میں نصیب ہوگی، رجبکہ نگاہیں تیز کر دی جائیں گی) وہ اس تجلّی کو برداشت کر سکیں۔ وُہ دنیا میں کسی کو حاصل نہیں۔

ہاں ایک خاص درجہ کی رویت سیدنا محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو شب معراج میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے موافق میسّر ہُوئی اور اس خصُوصیت میں کوئی بشر آپ کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ نیز ان ہی انوار و تجلّیات کے تفاوت و تنوع پر نظر کرتے ہُوئے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال میں کوئی تعارض نہیں۔

شاید وہ نفی ایک درجہ میں کرتی ہوں اور یہ اثبات دُوسرے درجہ میں کر رہے ہیں اور اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت رایت نورًا اور نورٌ انّٰی اَراہُ میں تطبیق ممکن ہے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

مضمون بہت طویل ہوگیا، مگر پھر بھی ناتمام رہا۔ کیا عرض کیا جائے، واقعہ یہ ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین ●●

پروفیسر رزمی صدیقی مرحوم

نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تصوّر آپ کا اے رحمۃ للعالمیں آیا
کہ مایوسانِ رحمت کو بھی بخشش کا یقیں آیا

محمدؐ کے غلاموں کی کلاہیں کتنی دلکش ہیں
کہ حاشق ہو کے ان پر طرّۂ فتح مبیں آیا

مبارک اے گنہگارو! کہ دربارِ قیامت میں
تمہارا آسرا بن کر شفیع المذنبیںؐ آیا

ہُوا کرتے ہیں خوش سب، واپسی ہوتی ہے جب لیکن
نصیب اُس کے مدینے جا کے جو واپس نہیں آیا

مَیں طیبہ کی گدائی پر نچھاور اس کو کر دوں گا
اگر ملکِ سلیماں بھی مرے زیرِ نگیں آیا

وُہ ہمدردی کی میٹھی آنچ پگھلاتی تھی دشمن کو
گرا قدموں پہ رو کے حلقہ میں جو نکتہ چیں آیا

قدم سائنس کے مڑنے لگے اسلام کی جانب
تجھے اُمّی کی حکمت کا بتا اب بھی یقیں آیا

ہوائے نفس شامل تھی نہ اس کی لب کشائی میں
اِدھر اُمّت نے کچھ پوچھا اُدھر روح الامیں آیا

شہنشاہ اممؐ کی نعت اور یہ فکر آئی ہے
خموش اے رزمی عاصی بڑا باریک بیں آیا

فتنوں کی سرکوبی

قسط : ۹

اولٰئک ھم الراشدون

"خلافت و ملوکیت" کے جواب میں

(شیخ الحدیث حضرۃ علامہ مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ)

قبائلیت کی چنگاری

مفصلہ بالا واقعات پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ قبائلیت کی چنگاری کہاں سُلگی اور اس کو کس نے سلگایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو تقررات کیے ان سے سُلگی یا ان شورہ پشتوں نے اس چنگاری کو سُلگایا جو حضرت سعیدؓ کے اس فقرہ پر برافروختہ ہو گئے تھے کہ سواد عراق بستانِ قریش ہے۔

باشندگان کوفہ کون تھے؟

مجاہدین اسلام جو سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت قادسیہ اور جلولاء کے عظیم معرکوں میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ پھر مملکتِ فارس کا پایۂ تخت مدائن بھی فتح کر چکے تھے۔ وہ مدائن کو فوجی مرکز بنا سکتے تھے، مگر اس علاقہ کی آب و ہوا ان کے موافق نہیں تھی تو یہ سرزمین منتخب کی گئی جہاں کوفہ آباد کیا گیا۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۷ھ کے محرم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مدائن سے کوفہ منتقل ہوئے، لہٰذا اس کے پہلے آباد کار وہ تھے جو جنگِ قادسیہ میں شریک تھے۔

۱۔ ان میں حضرات صحابہؓ تقریباً پونے ۳۰۰ سو تھے، حضرات اہلِ بدر ستر سے چند زائد۔ فتح مکہ سے پہلے کے حضرات صحابہؓ جن میں وہ بھی تھے جو بیعتِ رضوان میں شریک تھے تقریباً ۳۱۳ فتح مکہ کے

وقت کے حضرات تین سو حضراتِ صحابہؓ کے ابناء اور فرزندان سات سو (طبری ص ۸۹ ج ۴) ان حضرات کا تعلق اگرچہ مختلف قبائل سے تھا، مگر شرفِ صحابیت قبائلی تعلق پر غالب آچکا تھا اور اب صرف یہی نسبت اور صرف ایک ہی تعلق نمایاں تھا کہ بارگاہِ رسالت کے فیض یافتہ ہیں، صحابی ہیں یا کسی صحابی کے فرزند ہیں۔

۲۔ حضراتِ صحابہؓ کے علاوہ جو دوسرے عرب شریک ہوئے تھے وہ قبائلی نسبت لیے ہوئے تھے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

لاضربن ملوك العجم بملوك العرب (طبری ص ۸۶ ج ۴) میں ملوک عرب کے ذریعہ ملوک عجم پر ضرب لگاؤں گا۔

عرب میں ملوک نہیں تھے؛ البتہ بڑے بڑے قبائل کے شیوخ ملوک کی شان رکھتے تھے۔ بنو بکر بن وائل، عبدالقیس، ربیعہ، اسد، کندہ، تمیم، قضاعہ وغیرہ قبائل جو ہمیشہ اپنی عظمت اور اپنی شجاعت پر ناز کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو دعوت جہاد دی۔

یہ قبائل من حیث القبیلہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے معاشرتی لوازم یعنی شعراء اور خطباء بھی تھے (طبری ص ۸۶، ۸۷ ج ۴) مورخین نے ہر ایک قبیلہ کی تعداد ان کے گروپ اور ان کے سرداروں کے نام بھی لکھے ہیں۔

تاریخ کی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان قبائل نے بڑھ چڑھ کر قربانیاں پیش کیں اور عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ پھر یہی قبائل تھے جو اپنی قبائلی خصوصیات کے ساتھ کوفہ میں آباد ہوئے (ابن خلدون ص ۳۸ ج ۲) بارہ ہزار اہلِ یمن کے لیے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا۔ قبیلہ نزار کے افراد آٹھ ہزار تھے۔ ان کو ایک خطہ دے دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ (فتوح البلدان ص ۲۵۵)

۳۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی فوج کی تعداد اگرچہ تینتیس ۳۳ ہزار کے قریب تھی (طبری ص ۸۷ ج ۴) لیکن جب کوفہ کو اس علاقہ کے مرکز کی حیثیت دے دی گئی تو فوج کی تعداد چالیس ہزار کر دی گئی۔ ہر سال دس ہزار جوان اس علاقہ کے مختلف محاذوں پر کام کرتے اور تیس ہزار محفوظ رہتے تھے۔ اس طرح ہر

ایک فوجی تین سال تک محفوظ رہتا اور چوتھے سال اس کا نمبر آتا تھا (طبری صہ ج ۵)

۴۔ جنگِ قادسیہ میں ایرانی سپہ سالار (رستم) کے ساتھ منتخب جوانوں کی ایک خاص فوج تھی، جو "جند شاہنشاہ" شاہی فوج کہلاتی تھی۔ اس کے نوجوان اگرچہ ایرانیوں کے ہم نسل یا ہم مذہب (مجوسی) نہیں تھے، لیکن اپنے جنگی کارناموں کے باعث ان کی یہ فوج خاص اہمیت رکھتی تھی۔ جنگِ قادسیہ میں اہلِ ایران کو شکست ہوئی تو ان کو اپنے مستقبل کی فکر ہوئی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ باعزت معاہدہ کو حال اور مستقبل کے لیے مفید سمجھا؛ چنانچہ صرف دو شرطوں کے ساتھ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے امن کی درخواست کی۔ اوّل یہ کہ وہ آزاد ہوں کہ جس مقام کو چاہیں اپنے قیام کے لیے منتخب کرلیں۔ دوم یہ کہ جس قبیلہ سے مناسب سمجھیں عقدِ موالات (یعنی باہمی تعاون وتناصر تا حین حیات اور مرنے جینے کے ساتھی رہنے) کا معاہدہ کرلیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ شرطیں منظور فرمالیں، بلکہ ان کے وظائف بھی مقرر کردیے۔

اس جند شاہنشاہ نے فتح مدائن اور جنگِ جلولاء وغیرہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ پھر یہ لوگ کوفہ میں آکر آباد ہوگئے۔ (فتوح البلدان صہ ۲۸۹)

۵۔ بصرہ کے قریب ایک قوم آباد تھی، اس کو اساورہ کہا جاتا تھا۔ یہ بھی وہاں سے منتقل ہوئے اور اپنے ڈیرے کوفہ میں ڈال دیے۔ (فتوح البلدان صہ ۲۸۹ بلاذری)

عجمی اقوام کو موالی کہا جاتا تھا، کیونکہ مولی آزاد کردہ غلام کو کہتے ہیں اور جس سے تعاون باہمی کا معاہدہ ہو جائے اس کو بھی مولی کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے نہ صرف وقتی امداد بلکہ جینے اور مرنے کا ساتھ ہوجاتا تھا۔ عجمی لوگ آزاد کردہ غلام بھی تھے اور بڑی کثرت سے وہ بھی تھے۔ جنہوں نے قبائل سے معاہدے کر رکھے تھے، اِس لیے ان کو موالی کہا جاتا تھا۔

۶۔ پہلے گزر چکا ہے کہ جب صفر ۲۳ھ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا تو فرمایا تھا؛ کیف واھل الکوفۃ مِائۃ والف ۱۰۰۰۰۰۔ مطلب یہ ہے کہ ۲۳ھ میں کوفہ کی آبادی ایک لاکھ ہوگئی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ صہ ۱۲۶ ج ۷)

دورِ حاضر کے مستشرق ول ہوسن (WELL HOUSEN) کی تحقیق یہ ہے:

"باشندگانِ کوفہ میں نصف سے زائد موالی تھے۔ یہ مختلف پیشے کرتے تھے۔ دستکار بھی تھے، کاشت بھی کرتے تھے۔ زیادہ تر فارس کے رہنے والے تھے۔ نسل کے لحاظ سے بھی فارسی تھے اور ان کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اسیرانِ جنگ کی حیثیت میں غلام بن کر آئے تھے۔ مسلمان ہو گئے تو ان کے مالکوں نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ آزاد بے شک ہو گئے، مگر غریب الوطن تھے، اس لیے ان کو ضرورت رہی کہ وہ اپنے آزاد کرنے والوں کی حمایت حاصل کریں۔ بس وہ عرب کے حاشیہ نشین ہو گئے۔ یہ صلح اور جنگ میں عرب آقاؤں کے تابع رہا کرتے تھے (فجر الاسلام صد ۱۱۵)

مزاج

سید الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں قبائل عرب انتظار کر رہے تھے کہ پلہ کس کا بھاری رہتا ہے، قریش کا یا مسلمانوں کا۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور قریش حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو یہ قبائل اسلام کی طرف لپکے اور ارشادِ ربانی "یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کے بموجب عرب کے تمام قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے، مگر داخلہ کی شکل یہ ہوتی تھی کہ قبیلہ اپنے شیخ کو یا اپنے چند نمائندوں کو بھیج دیتا۔ وہ دربارِ رسالت میں حاضر ہوتے، ضرورت سمجھتے تو سوالات کر کے اطمینان بھی حاصل کرتے۔ پھر کلمۂ توحید پڑھ کر نہ صرف اپنے بلکہ پورے قبیلہ کے اسلام کا اعلان کر دیتے تھے۔ اب مسلمان پورا قبیلہ ہو جاتا تھا، مگر بارگاہِ رسالت سے مستفید ہونے اور شرفِ صحابیت کے تاجدار بننے کا موقع صرف ایک شیخِ قبیلہ کو یا چند نمائندوں کو حاصل ہوتا تھا۔ اہلِ قبیلہ جس طرح سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے محروم تھے وہ عموماً ان ذہنی اور جذباتی تبدیلیوں سے بھی ناآشنا رہتے جو اسلامی تعلیمات اور شرفِ صحابیت کی خصوصیات تھیں، لیکن چند سال بعد جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو "دعوتِ جہاد" دی اور انہیں قبائل نے قادسیہ اور جلولاء وغیرہ کی لڑائیوں میں بہادری اور سپہ گری کے جوہر دکھاتے ہوئے ان معرکوں میں شاندار کامیابی حاصل کی، تو اب ان کو ناز ہو گیا کہ سفینۂ اسلام کے ناخدا وہی ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں یہ قبائل قریش کی عظمت کے صرف اسی حد تک قائل تھے کہ وہ خانۂ کعبہ کے محافظ اور خادم ہیں، لیکن اب سیاست کی باگ ڈور قریش کے ہاتھ میں دیکھی تو بقول علامہ ابنِ خلدون زمانۂ جاہلیت کی

رگیں پھڑکنے لگیں اور اب ان کو یہ بھی ناگوار ہوا کہ حضرات مہاجرین اور انصار (رضوان اللہ علیہم) کو یہ برتری کیوں حاصل ہے (ص ۱۳۸ ج ۲ ابن خلدون)

سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جن کے آباد کردہ کوفہ میں یہ لوگ سکونت پذیر تھے، سب سے پہلے اسی محسن کے خلاف بے بنیاد الزامات کا طومار اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا۔ پھر انہیں لوگوں نے بصرہ میں سیدنا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ہدف بنایا۔ یہ قریش نہیں تھے، مگر صحابیت کی بنا پر ان کا اعزاز بھی ان نوخیز قبائل کو ناگوار تھا۔

عربوں کے علاوہ بڑی تعداد موالی کی تھی۔ شاہی فوج کے چار ہزار جوانوں کے علاوہ ان میں زیادہ وہ تھے جو جنگِ جلولاء میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ اپنے اپنے مقام پر صاحبِ حیثیت لوگ تھے۔ ان میں پڑھے لکھے صاحبِ فکر اور اصحاب الرائے بھی تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان کی یہ صلاحیتیں اسلامی خدمات میں صرف ہوئیں، مگر اس دور میں ایسے صالح موالی کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ تر بلکہ عموماً وہی تھے جو اگرچہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے، مگر ان کے دل اسی طرح شوخ تھے یا اگر گرفتار تھے تو ان جذبات و نظریات کی کمند میں جو سرزمینِ ایران میں ان کو نسلی وراثت کے طور پر ملے تھے۔

علامہ دینوری نے اپنی مشہور تصنیف (الاخبار الطوال) میں لکھا ہے کہ معرکۂ جلولاء میں اتنا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا کہ اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اور اسی طرح بڑی کثرت سے دشمن کے فوجی بھی گرفتار ہوئے۔ ان کے ساتھ بہت سی عورتیں بھی تھیں، جن کا تعلق فارس کے بڑے بڑے گھرانوں سے تھا۔ (بنات احرار فارس)

جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے رپورٹ پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا: اللھم انی اعوذ بک من اولاد سبایا الجلولیات (جنگِ جلولاء میں جو عورتیں گرفتار ہو کر آئی ہیں میں ان کی اولاد سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں) چنانچہ ان جلولی عورتوں کی اولاد ہی تھی جو صفین میں معرکہ آرا ہوئی۔ (فجر الاسلام ص ۱۱۷)

بہرحال عربوں کے علاوہ موالی کا مزاج وہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سے پناہ مانگی تھی۔

ماحول

خلیفۂ وقت یعنی پوری مملکت کا سربراہ یا کسی معمولی جماعت کا قائد و رہنما اس کے متعلق کوئی رائے قائم کر لینا اس وقت تک درست نہیں جب تک ان حالات کا نقشہ سامنے نہ ہو، جن کی کش مکش میں اس کو کام کرنا پڑا۔

مودودی صاحب جیسا زیرک اور فرزانہ صاحبِ قلم ان حالات کو اسی صورت میں نظر انداز کر سکتا ہے جب کسی شخصیت کے متعلق یکطرفہ رائے قائم کرنی اور اس کو مجرم گردانا مقصود ہو۔

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ مبارک میں جو غیر معمولی فتوحات حاصل ہوئیں، کیا کوئی صاحبِ عقل و فہم یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کا کوئی ردِ عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایران کی شاہنشاہیت جو چند سال پہلے تک پوری دُنیا ورنہ ایشیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنے جاہ و جلال اور دبدبہ و سطوت میں نظیر نہیں رکھتی تھی، بلکہ ایک خاص تہذیب اور شاندار تاریخ کی مالک تھی۔ جس نے اس کے تاجپوشوں کو معبودوں کا درجہ دے رکھا تھا جس کے ماتحت بیشمار نواب اور راجا اور وہ مذہبی پیشوا تھے جو اپنی شان و شوکت میں بادشاہوں کا درجہ رکھتے تھے، جن کے غرور اور نخوت کا یہ عالم تھا کہ وہ عرب کے بڑے بڑے سرداروں کو بھی چرواہوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ انہیں چرواہوں کے ہاتھوں یہ شاہنشاہیت برباد ہوئی۔ اس کے نواب تباہ ہوئے، شاہزادے غلام اور شاہزادیاں باندیاں بنائی گئیں، مذہبی پیشواؤں کا نام و نشان مٹا۔ کیا اس کا کوئی ردِ عمل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا ان مٹنے والوں کے وارثوں کے دل جذباتِ انتقام سے پاک ہو گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی گردنیں جھکی تھیں، مگر ان کے دلوں میں جذباتِ انتقام کے تنور دہک رہے تھے۔ وہ ان چرواہوں کے سامنے جھکنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے (الا ماشاء اللہ)

اسی طرح وہ یہودی جو دشمنِ اسلام رہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جزیرۃ العرب کو ان کے وجود سے پاک کرنے کے لیے ان کو خیبر سے بھی جلاوطن کر کے شام پہنچا دیا تھا۔ وہ جزیرۃ العرب سے نکلے تھے، مگر مملکتِ اسلام سے جلاوطن نہیں ہوئے تھے اور نہ ان کے دلوں کے وہ کانٹے نکلے تھے جو ان کی مذہبی خصوصیات میں داخل تھے۔

جب جزیرۃ العرب کو خالص اسلامی مرکز بنایا گیا، تو نجران وغیرہ سے عیسائیوں کو بھی نکالا گیا۔ عرب

عیسائیوں کی ریاستیں جو اطراف شام میں تھیں جب اس علاقہ سے رومی حکومت کے اقتدار کا خاتمہ ہوا تو یہ عرب عیسائیوں کی ریاستیں بھی ختم ہوگئیں۔ ان کے خاتمہ کا اثر عام عربوں پر یہ تھا کہ صدیوں بعد تک افسانوں اور کہانیوں میں آلِ غسّان کے کارناموں کا ماتم کیا جاتا رہا۔

اس کے علاوہ عیسائیوں کی مرکزی حکومت اپنی شان و شوکت کے ساتھ قائم تھی اور اس سے ہیبت انگیز لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ نفاق کے پرانے مرکز جو کچھ مدینہ میں اور زیادہ تر ماحولِ مدینہ میں تھے (سورۃ توبہ آیت ۱۰۰) جو عہدِ رسالت کے آخر تک رہے، وہ اگر ختم ہو گئے تھے تو کیا عہدِ فاروقی کے شکست خوردہ طبقات کے لیے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ نفاق کے نئے اڈے قائم کریں۔

یہ اسلامی معاشرے سے باہر کے اثرات تھے، خود اسلامی معاشرے میں وہ تبدیلی رونما ہو رہی تھی جس کی طرف کلام ربانی نے اسی وقت اشارہ کر دیا تھا۔ جب اس مملکت کی عظیم الشان عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، یعنی سورہ اقرأ ہی میں انسان کی اس فطرت سے آگاہ کر دیا تھا۔

لِيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے: انسان سرچڑھتا ہے اس سے کہ دیکھے آپ کو محفوظ (صاحبِ نصیب، دولت مند)

یعنی انسان جب دیکھتا ہے کہ اقبال اس کا استقبال کر رہا ہے اور کامیابیاں اس کے ہم رکاب ہیں تو اس کے دماغ میں طغیانی آجاتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے اقتدار کو بھی چیلنج کرنے لگتا ہے کہ تمہیں اس مسند پر بیٹھنے کا حق نہیں ہے، تم ہٹ جاؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے کچھ پہلے جب برسرِ منبر امت کو یہ بشارت سنائی تھی ——— اعطیت مفاتیح خزائن الارض (روئے زمین کے خزانوں کی کنجیاں مجھے دے دی گئیں، تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا:

وانی واللہ ما اخاف ان تشرکوا بعدی ولکنی اخاف علیکم ان تنافسوا فیھا (بخاری شریف ص ۹۵۱)	قسم بخدا مجھے یہ خطرہ نہیں کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے، البتہ مجھے اسکا خطرہ ہے کہ تمہارے اندر منافست پیدا ہو جائیگی۔ یعنی آگے بڑھنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے جذبات ابھر آئینگے۔

ایک صاحب نے سوال کیا:

اویاتی الخیر بالشر — کیا خیر شر پیدا کر سکتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے اور گہرے غور و فکر کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ خیال ہوا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ پھر پیشانی مبارک سے پسینہ پونچھتے ہوئے سائل کو جواب دیا۔

"خیر سے تو خیر ہی پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر خیر کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے، تو لامحالہ شر رونما ہوتا ہے۔ آپ نے مثال دی کہ موسمِ بہار میں جب سبزہ پیدا ہوتا ہے، وہ خیر ہی خیر ہے، لیکن چرنے والے جانور کے لیے وہ اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب چرنے کے ساتھ ہضم بھی کرتا ہے، لیکن اگر ہضم کے بغیر چرتا ہی چلا جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اپھارا (تخمہ) ہو جائے گا، جو اسکو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ یا موت کے قریب پہنچا دے گا۔ (بخاری شریف صہ ۱۹۷، صہ ۳۹۸، صہ ۹۵۱ وغیرہ)

مفاتیح خزائن الارض (زمین کے خزانوں کی کنجیاں) جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بدولت امت کو عطا ہوئیں۔ وہ صرف اموالِ غنیمت یا صرف قیصر و کسریٰ کے خزانے نہیں تھے، ان کے متعلق تو پیشین گوئی یہ تھی کہ ان خزانوں کو راہِ خدا میں خرچ کرو گے۔ (بخاری شریف صہ ۵۱۱)

بلکہ مفاتیح خزائن الارض وہ تجارتی وسائل تھے جو مسلمانوں کو میسر آ گئے تھے۔

قریش کے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے پہلے بھی تھے اور اسی وجہ سے وہ سرزمینِ عرب میں سب سے زیادہ دولت مند تھے، مگر یہ تعلقات چند تجارتی قافلوں کی حد تک تھے، جو یمن، شام یا عراق جاتے، وہاں کے نوابوں یا بادشاہوں کی خوشامدیں کرتے ہوئے اپنا مال فروخت کرتے اور وہاں سے کچھ مال سرزمینِ عرب کے چند شہروں کے لیے لے آتے تھے، لیکن اب صورت یہ تھی کہ شام، عراق، یمن، مصر اور افریقہ کے تمام زرخیز علاقے مسلمانوں کے ہو چکے تھے۔ خود ان علاقوں کی اندرونی تجارت پر بھی مسلمانوں کا قبضہ تھا، اور یورپ اور ایشیا بالفاظِ دیگر مشرق و مغرب کے ڈانڈے انہیں علاقوں کے ذریعے ملتے تھے، تو گویا تمام دنیا کے تجارتی ذرائع پر مسلمانوں کو بالادستی حاصل ہو گئی تھی اور فی الواقع خزائنِ ارض کی کنجیاں مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی عرب کے گھر میں بھی دولت کے انبار لگ گئے تھے۔

بلا خوفِ تردید نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فراوانیٔ دولت اور افراطِ زر کے اس بحران میں بھی اپنے اسی مقام پر قائم رہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں ان کے لیے معین ہو چکا تھا۔

سید الانبیاء محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا وہ تریاق ان کو میسر تھا کہ سنہری روپہلی دولت کے انبار پر جب ان کی نظر پڑتی تو فخر و غرور اور دماغی طغیانی کا زہر تو کیا پیدا ہوتا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی تنگی اور تنگ دستی ان کو یاد آتی اور یہ دولت خوشی کے بجائے کڑھن کا سبب بن جاتی تھی۔

سیدنا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتنا سونا ترکہ میں چھوڑا تھا کہ ہتھوڑوں سے کاٹا گیا اور کاٹنے والوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور چار بیویوں میں سے ہر ایک بیوی کو اسی اسی ہزار کی رقم ملی (البدایہ والنہایہ صہ ۱۶۴ ج ۷) جب کہ وصیت یہ کی تھی کہ اصحابِ بدر میں سے جو بھی زندہ ہیں ان کو چار چار سو دینار ان کے ترکہ میں سے دیے جائیں۔ اسی طرح ازواجِ مطہرات کے لیے رقمِ خطیر کی وصیت کی تھی۔ ان کے علاوہ اور مدات خیر کی وصیت تھی۔

انہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے یہاں غلّہ آیا جو سات سو اونٹوں پر لدا ہوا تھا۔ پھر ایک حدیث کی بناء پر جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ ان کو پہنچی نہ صرف غلّہ بلکہ وہ اونٹ اپنے ساز و سامان کے ساتھ فی سبیل اللہ تقسیم کر دیے۔ (البدایۃ والنہایۃ صہ ۱۶۴ ج ۷)

انہیں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا یہ دل دوز واقعہ حضرت نوفل بن ایاس ہذلی بیان کرتے ہیں کہ کھانے کا وقت ہوا۔ دسترخوان پر کھانا چُنا گیا، تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہو گیا۔ سبب پوچھا گیا تو جواب دیا کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حالت میں رخصت ہو گئے کہ آپ کو اور آپ کے اہلِ بیت کو جو کی روٹی بھی پیٹ بھر نہیں ملتی تھی اور ہمارے سامنے یہ نعمت رکھی ہوئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ ہمارے لیے کوئی بہتر صورت ہے۔ (شمائل ترمذی شریف صہ ۲۷)

حضرت خباب بن الارت بیمار تھے۔ حضرت ابووائل مزاج پرسی کے لیے گئے تو حضرت خباب پر رقت

طاری تھی۔ فرمانے لگے ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی۔ رضائے الٰہی ہمارا نصب العین اور مقصد تھا۔ اللہ تعالےٰ کے یہاں ہمارا اجر و ثواب لکھا گیا۔ پھر کچھ وہ خوش نصیب تھے جنہوں نے اس دنیا میں اس اجر کا کوئی حصہ وصول نہیں کیا۔ ان میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی تھے جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ صرف ایک چھوٹا سا کمبل ان کے ساتھ تھا۔ اگر سر چھپاتے تو پیر کھل جاتے تھے اور پیر چھپاتے تھے تو سر کھل جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب ہم نے سر چھپا دیا اور پیروں پر اذخر گھاس ڈال دی۔ (ان کے برخلاف) ہماری ہی جماعت میں وہ بھی ہیں (اپنی ذات مراد ہے) جن کے گلشنِ عمل کے پھل پک چکے ہیں اور وہ ان کو (دنیا ہی میں) توڑ رہے ہیں۔ (بخاری شریف ص ۵۵۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک وہ وقت تھا کہ میں ایک درہم کا بھی مالک نہیں تھا۔ آج حالت یہ ہے کہ مکان کے ایک کنارے میں چالیس ہزار درہم پڑے ہوئے ہیں (مشکوٰۃ شریف ص ۱۳۲، بحوالہ ترمذی و احمد)

اسی طرح کے بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن کی شہادت یہ ہے کہ افراطِ زر نے حضراتِ صحابہ کو متاثر نہیں کیا۔ لیکن اب امتِ اسلامیہ صرف صحابہ کرام کا نام نہیں تھا۔ اب غیر معمولی اکثریت ان کی تھی جن کی مثال پہلے گزر چکی ہے کہ ان کو حضرات مہاجرین و انصار کی برتری بھی اکھرنے لگی تھی ـــ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اب ایسے ہی رہ گئے تھے جیسے آڑو کے دانہ میں سفیدی۔

ایران کے شاہی محل کے بیش بہا فرش فروش، تاجِ شاہی اور بادشاہ کے زیورات جب مدینہ پہنچے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی احتیاط کی یہ حالت تھی کہ آپ کو گوارا نہ ہوا کہ وہ ایک شب بھی دربارِ خلافت کی چھت کے نیچے گزاریں۔ آپ نے ان کو باہر رکھوایا۔ پھر ان کے ٹکڑے کر کے تقسیم کرا دیے۔ قالین کا ایک ٹکڑا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملا جو آپ نے بیس ہزار میں بیچا۔ (البدایہ والنہایہ ص ۶۷ ج ۷)

لیکن فاروق اعظم کی آنکھیں جو بیش بہا دولت کو دیکھ رہی تھیں، خیرہ ہونے کے بجائے اشکبار تھیں۔ عرض کیا گیا کہ یہ مقامِ مسرت ہے نہ مقامِ گریہ۔ حضرت فاروق اعظم نے جو جواب دیا وہ اس صورتِ حال کی عکاسی کر رہا تھا، جو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پیش آ گئی۔

تاللہ ما اعطی اللہ ھذا قوما الا تحاسدوا وتباغضوا ولا تحاسدوا الا القی باسھم بینھم (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص)

یہ دولت جن کے یہاں پہنچتی ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے حسد اور بغض رکھنے لگتے ہیں اور حسد و بغض کا نتیجہ خانہ جنگی ہوتا ہے۔

مودودی صاحب کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فرضی خویش نوازی میں قبائلی عصبیت کی چنگاریاں نظر آئیں، مگر افسوس ان کی نظر اس پر نہیں پڑی کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے:

لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی فی المال (ترمذی شریف ص ۵۲ ج ۲) ہر ایک امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کے لیے فتنہ دولت ہے۔

فتنوں کے متعلق پیشین گوئیاں

یہ خارجی اور داخلی محرکات یعنی مفتوحہ اور شکست خوردہ اقوام کا ردِ عمل دوسری طرف فراوانیٔ دولت اور اس کے اثرات۔ اس ذاتِ اقدس کی نظرِ دُور رس سے اوجھل نہیں تھے۔ جس کو "علم الاولین والاخرین" عطا فرمایا گیا تھا۔ آپ کی پیغمبرانہ فراست محسوس کر رہی تھی کہ مستقبل نہایت خطرناک ہے۔

کتاب الفتن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات محفوظ ہیں جو ان فتنوں کے متعلق زبانِ مبارک سے صادر ہوئے۔

سیدنا حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بڑی توجہ سے ایسے ارشادات یاد رکھا کرتے تھے، جو فتنوں کے بارے میں لسانِ نبوت سے صادر ہوتے تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے متعلق باتیں دریافت کیا کرتے تھے اور میں شر کے متعلق معلومات حاصل کیا کرتا تھا کہ مبادا میں کسی شر میں مبتلا ہو جاؤں (بخاری شریف ص ۱۰۴۹)

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جن کی فراست ضرب المثل ہے وہ بھی اس خطرناک اور ہیبت انگیز ردِ عمل سے مطمئن نہیں تھے۔ آپ کو خود اپنے دورِ مبارک میں بھی اس کا خطرہ رہتا تھا؛ چنانچہ ایک روز حاضرینِ مجلس سے دریافت فرمایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو فتنہ کے بارے میں ہیں، کسی کو یاد ہیں؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ نے فوراً جواب دیا: "مجھے"۔ آپ نے فرمایا، بیان کرو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ

نے فرمایا انسان کا فتنہ مال میں بھی ہوتا ہے، اپنی جان میں بھی اور اپنے اہل وعیال میں بھی۔ نماز، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا۔ یہ فتنے نہیں۔ میں اس فتنہ کے متعلق دریافت کر رہا ہوں جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارے گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ کو اس کی کیا فکر؟ اس کا کوئی نقصان آپ کو برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ کے اور اس فتنہ کے درمیان ایک دروازہ ہے جس پہ تالا لگا ہوا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضؓ : کیا یہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا۔

حضرت حذیفہ رضؓ : توڑا جائے گا۔

حضرت فاروق اعظم رضؓ : پھر تو دوبارہ بند نہ ہو سکے گا۔

حضرت حذیفہ رضؓ : جی ہاں (بخاری شریف ص ۱۰۵۱)

فتنہ کا وقت

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ فراست کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ آپ نے اس فتنہ کے وقت کی بھی نشاندہی کر دی تھی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا

معها بلاء يصيبه (بخاری شریف ص ۱۰۵۲) اس بشارت کے ساتھ سخت آزمائش بھی ہو گی۔

سخت آزمائش شہادت نہیں، شرفِ شہادت تو حضرت فاروق اعظم رضؓ کو بھی حاصل ہوا۔ سخت آزمائش یہ ہے کہ مختلف جذبات جن میں قریشی اور غیر قریشی کا مسئلہ بھی تھا جذبہ کی حد سے آگے بڑھ کر عمل کی سرحد میں داخل ہونے لگے گا۔ حضرت ذی النورین کا دور خلافت انہیں جذبات کی کشاکش میں گزرا۔

علامہ ابنِ خلدون قبائل بنی بکر و عبد القیس و ربیعہ وغیرہ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:

"ان قبائل کی جاہلیت کی رگیں پھڑکنے لگیں اور انہوں نے دیکھا کہ حضرات مہاجرین جو قریشی بھی ہیں اور غیر قریشی بھی۔ اور حضرات انصار کو ان پہ اقتدار حاصل ہے۔

وتالفت نفوسهم منه و وافق ایام عثمان (ص ۱۳۸) ان کے نفوس اس اقتدار سے نفرت کرنے لگے اور اتفاق یہ ہوا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا۔

عناصر فتنہ کی تنظیم اور حضرت عثمان رضؓ کے متعلق فرد جرم کی تصنیف

فتنہ کا ایک عنصر مفتوحہ اقوام بالخصوص ایرانیوں کا جذبۂ انتقام تھا جس کے تحت کار روائی ایرانیوں کی پہلی شکست کے بعد سے ہی شروع ہوگئی تھی۔

چنانچہ خاص اس وقت میں کہ شاہِ ایران یزدجرد اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس لینے کے لیے آخری بازی لگا رہا تھا اور اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ فوج فراہم کر چکا تھا۔ دوسری طرف اس محاذ کے ذمّہ دار اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ کی تیاری کر رہے تھے۔ خاص اس نازک وقت میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے خلاف ایک فتنہ اٹھایا گیا اور بے بنیاد اور سراسر غلط شکایتوں کا میمورنڈم حضرت فاروق اعظم کی بارگاہ میں پیش کیا گیا۔ حضرت فاروق اعظم کو خود حیرت ہوئی۔ آپ نے فرمایا: اس نازک وقت میں یہ حرکت خود تمہارے بُرے ارادوں اور شرارتوں کی دلیل ہے (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۰۶)

اب آپ غور فرمائیے۔ کیا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ احساس صحیح نہیں تھا؟ کیا ایسے وقت میں یہ نہیں ہوتا کہ حریف کے کچھ آدمیوں کو آلۂ کار بنا کر حریف کی صفوں میں رخنہ ڈالا جاتا ہے۔

شکایتی ڈیپوٹیشن لے جانے والے کیا مسلمانانِ کوفہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اہلِ کوفہ کو تو کوئی شکایت نہیں تھی۔ جب تحقیقاتی کمیشن نے بیانات لیے تو صرف ایک کے علاوہ باقی تمام باشندگانِ کوفہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تعریف ہی کی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ شکایت کرنے والے شکست خوردہ ایرانیوں کے آلۂ کار اور دورِ حاضر کی اصطلاح میں "ففتھ کالمسٹ" (پانچویں کالم) ہوں جو یزدجرد کے لیے کام کر رہے ہوں۔ قرائن کی واضح شہادت یہ ہے کہ یہ لوگ آلۂ کار تھے۔

کچھ عرصہ بعد سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے۔ ایک طبقہ کا احساس یہ تھا کہ یہ ایرانیوں کی سازباز کا نتیجہ ہے۔ اسی احساس سے متأثر ہو کر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے منجھلے فرزند حضرت عبیداللہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا۔ (طبری ج ۵ ص ۲۲،۱۴۱)

بصرہ میں ایک پارٹی تھی، آج کل کی اصطلاح میں ایک گینگ تھا جس کا سربراہ حکیم بن جبلہ تھا۔ جب اسلامی لشکر اس طرف سے گزرتا تو حکیم بن جبلہ اور اس کے ساتھی خفیہ طور سے اس کے ساتھ ہو جاتے۔

پھر جہاں موقع پاتے ذمیوں پر ڈاکے ڈالتے، فساد پھیلاتے۔ اس پارٹی کا ظہور اگرچہ کچھ عرصہ بعد یعنی خلافتِ عثمانی کے سالِ چہارم میں ہوا۔ (طبری ص ۹۰ ج ۵) مگر ظاہر ہے اس کا وجود پہلے سے قائم ہو چکا تھا۔ بہرحال یہ عناصر تھے اور موقع بموقع کام کر رہے تھے، مگر ان کے آپس میں کوئی تنظیم نہیں تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جہاں یہ اتفاق ہوا کہ بقول علامہ ابنِ خلدون قبائلِ بنو بکر وغیرہ کی رگِ جاہلیت پھڑکی اور قبائلی عصبیت کی چنگاریاں شعلہ بننے لگیں۔ ایسے ہی یہ بھی اتفاق ہوا کہ ان فتنہ پرور عناصر کو ایک لیڈر مل گیا۔ یہ لیڈر کون تھا، ہر ایک مؤرخ اس کو جانتا ہے۔ یہ عبداللہ بن سبا تھا جس نے جذبات کو تحریک کی شکل دی، تحریک کو منظم کیا۔ پھر اس طوفان کا دہانہ کھولا، جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ وہ تمام کتابیں جو بقول مودودی صاحب تاریخِ اسلام کی معتبر کتابیں ہیں اس لیڈر کے تذکرے سے پُر ہیں۔ کٹی کٹی اوراق میں اس کے رسوائے عالم کارناموں کا تذکرہ ہے۔ ہم انہیں کتابوں سے اخذ کر کے اس لیڈر کا تعارف کراتے ہیں۔ پھر اس کے کچھ کارنامے درج کرتے ہیں:-

تلاش

الهدية السنية فی احوال المدرسة الديوبندية

جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی کی تصنیف ہے۔ برائے مطالعہ درکار ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس ہو تو مستعار عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

مینجر انوار مدینہ۔ جامعہ مدنیہ لاہور

خلیق و دیانتدار عملہ
بہترین و با رعایت طباعت

المکہ پریس

۵۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

أُولٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ

انوارِ صحابہ رضی اللہ عنہم

حضرۃ مولانا بشیر احمد صاحب پسروری مدظلہ خلیفہ مجاز حضرۃ لاہوری رحمہ اللہ

حضرت عمّار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہ سابقین فی الاسلام میں سے ہیں۔ ان کی والدہ محترمہ حضرت سمیّہ رضی اللہ عنہا کفّار کے گھروں میں محنت مشقت کر کے گزر اوقات کیا کرتی تھیں۔ اس خاندان نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفّار کے ہاتھوں دل گداز اور صبر آزما اور درد اور مصائب کے باوجود انتہائی استقامت کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مظلومیت کو دیکھ کر چشم پُرنم اور دل پر از غم ہو کر فرمایا کرتے تھے: "صبراً یا آل یاسر فانّ موعدکم الجنّۃ" — "اے یاسر کے خاندان والو! مصائب میں صبر کا بہترین نمونہ پیش کرو۔ تمہارا انجام کار جنّت میں ہوگا۔" اسلام قبول کرنے میں یہ خاندان ساتویں نمبر پر تھا۔ یہ مقدس خاندان بھی ہجرت کر کے مدینہ عالیہ پہنچا۔ سراج اہل الجنۃ حضرت امیر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت عمّار کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ ایک دفعہ حضرت خالدؓ اور حضرت عمّار کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوئی۔ حضرت عمّارؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت خالدؓ کی زیادتی کا شکوہ کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا! "جو شخص عمّار کو تکلیف پہنچاتے گا اللہ تعالیٰ اس کو سزا دے گا۔ اور جس کا دل عمار سے دور ہوا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے دور کرے گا۔

حضرت عمار نے ۹۳ برس کی عمر پا کر شہادت پائی۔ (اصابہ جلد: ۲، ص ۵۰۵)

فائدہ: سبحان اللہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت ہیں کہ ان کا محب خدا کا مقرب ہوتا ہے اور ان کی محبت خدا کے قرب کا بہترین ذریعہ ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ممنوعات شرعیہ سے نفرت

حضرت عمارہؓ کہتے ہیں کہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد بیعت ہونے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ جناب نے اپنا مبارک

ہاتھ بیعت کے لیے آگے کرنے کے بجائے پیچھے ہٹا لیا۔ میں حضور کے اس رویہ سے متعجب ہوا اور پریشان بھی۔ مجلس والوں نے مجھے بتایا کہ تیرے ہاتھ پر کچھ رنگ لگا ہوا ہے اور شرعاً ہاتھوں کو سُرخ کرنا مردوں کے لیے ممنوع ہے۔ جاؤ پہلے دونوں ہاتھ خوب صاف کر کے آؤ۔ میں دونوں ہاتھ اچھی طرح صاف کر کے حاضر ہوا۔ پھر جناب نے مجھے بیعت سے مشرف فرمایا۔ (اصابہ ج ۲، ص ۵۱۹)

حضرت عمر بن ثابت اصیرم رضی اللہ عنہ

یہ انصار مدینہ سے تھے۔ جنگ احد میں شہید ہوئے۔ بنو عبدالاشہل انصاری نے میدانِ جنگ میں انہیں زخموں سے نڈھال دیکھ کر پوچھا کہ کیا تم قوم کی اعانت اور حمایت کے لڑنے آئے ہو یا اسلام کی قوت اور غلبہ کے لیے۔ حضرت ابن ثابت نے کہا کہ میں غلبۂ اسلام کے لیے آیا ہوں۔ اتنا کہہ کر خلد بریں میں پہنچ گئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ابن ثابت کا ذکر آیا تو جناب نے فرمایا: "انہ من اھل الجنۃ"۔ بیشک وہ اہلِ جنت سے ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کوئی انسان بتاؤ کہ جس نے ایک نماز بھی عمر بھر میں نہ پڑھی ہو اور وہ جنت میں گیا ہو۔ لوگ یہ سنکر اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے۔ تب حضرت ابوہریرہ انتہائی مسرت کے ساتھ فرماتے کہ ایک نماز پڑھے بغیر جو جنت میں گیا وہ اصیرم عمر بن ثابت تھا۔ یہ ساری عمر تو اسلام سے علیحدہ رہے۔ لیکن جنگ اُحد کے دن بالکل عین موقع پر اسلام قبول کر کے تلوار لے کر میدان میں پہنچے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد اور شہادت سے پہلے نماز کا وقت بھی نہیں آنے پایا تھا کہ شہید ہو گئے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابنِ ثابت کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ عمل قلیلاً واجر کثیراً۔ (اصابہ، جلد: ۲ ص: ۵۱۹)

حضرت عمرو بن العاص بن واعظ رضی اللہ عنہ

یہ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ۸ھ میں حبشہ میں نجاشی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے یہ قریش مکہ کے اس وفد میں شریک ہو کر مکہ پہنچے تھے جو وفد کفار مکہ نے اس لیے بھیجا تھا کہ وہ نجاشی

سے درخواست کریں وہ مہاجر مسلمانوں کو اپنے وطن سے نکال کر مکہ واپس لوٹا دے۔ لیکن حبشہ پہنچ کر حضرت عمرو بن عاص نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے رفقائے انتہائی غصّہ اور عداوت کی بنا پر مار پیٹ کے علاوہ ان کا تمام متاع بھی چھین لیا۔ حضرت عمرو بن عاص نے اپنی مظلومیت کی کہانی حضرت جعفر بن ابی طالب کی زبانی نجاشی تک پہنچائی۔ نجاشی نے اس مظلوم کی داستان سن کر لوٹا ہوا تمام سامان و مال واپس کروا دیا حضرت عمرو بن عاص سخاوت و جودت، بے کسوں کی ہمدردی اور دیگر صفات میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ ان صفات کی وجہ سے انھیں دربار نبوی میں بلند مقام حاصل ہوا۔ حضور علیہ السلام انھیں فوج کی کمان دے کر انھیں دشمنوں سے مقابلہ کے لیے روانہ فرمایا کرتے تھے۔ پھر عمّان کے گورنر بنا کر بھیجے گئے۔ سراج اہل الجنّۃ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کی قیادت میں بڑا علاقہ فتح ہوا۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے انھیں فلسطین کا گورنر بنا دیا۔ کتاب و سنت کی پابندی ان کی رُوح کی غذا تھی عرب کے چار نامور فاتحین بزرگوں میں سے ایک یہ بھی تھے۔ زبان رسالت سے انھیں جنتی ہونے کی بشارت ملی تھی۔ ان کی عملی زندگی اخلاص اور زہد کا بے نظیر نمونہ تھی۔

ایک دفع آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پیغام بھیجا کہ لباس درست کر کے اسلحہ لے کر فوراً پہنچو۔ یہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً پہنچے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمھیں ایک محاذ پر سالار فوج بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں اور مجھے قوی امید ہے کہ آپ فتح و نصرت اور مال غنیمت کے ساتھ واپس لوٹو گے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ میں مال غنیمت سے آپ کو معقول کثیر مقدار میں حصّہ دوں۔ حضرت عمرو بن عاص فرماتے ہیں میں نے عرض کیا۔ حضرت میں نے مال و دولت کے لیے اسلام قبول نہیں کیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم! ما بالمال الصالح للمرء الصالح — بے شک آپ نے اسلام کسی دنیوی غرض کے لیے قبول نہیں کیا۔ لیکن نیک بندوں کے پاس نیک وسائل سے مال و دولت پہنچ جائے تو کچھ ہرج نہیں اور ایسی دولت سے اسلام کو کوئی خطرہ اور نقصان نہیں۔

مال را گر بہر دین باشی حمول — نعم مال صالح گفتش رسول!

وہ مال و دولت جو شریعت کی حدود کے اندر کمایا جائے اور اسلامی مصارف پر خرچ کیا جائے وہ نعمت ہے۔

—— حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے پاکیزہ حالات ——

حیاتِ شیخ الاسلام

شیخ الحدیث حضرۃ علامہ مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ

قسط : ۸

مصائب کی وجہ

اے حضرات! آخر یہ ہر قسم کے پہاڑ ہم پر کیوں ٹوٹے ہیں کبھی بھی آپ نے اپنے اذہان کو اس طرف متوجہ کیا۔ کبھی بھی آپ نے اس پر غور کیا۔ اگر ذرا بھی آپ توجہ فرماتے تو یہ سب کچھ ہماری نااتفاقی اور موالات کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم ساڑھے پینتیس کروڑ مرد و زن، چھوٹے بڑے مسلم غیر مسلم ایک ہو جائیں تو بڑی سے بڑی قوت ہم پر ظلم و شدائد کی بارش نہیں برسا سکتی۔ گولیاں اور توپ کے گولے تو درکنار بجلی جیسی قوی چیز بھی اس ریگ کے تودہ میں نفوذ نہیں کر سکتی جس کے ضعیف و ناچیز ذرات مجتمع ہو کر ایک دوسرے پر جاں نثاری کر رہے ہوں۔

میں جہاں تک خیال کرتا ہوں نااتفاقی کی مضرتیں اور اتفاق کی ضرورتیں دینی اور دنیاوی ہر دو پہلو سے تمام پبلک سمجھ چکی ہے، بلکہ اس کا معائنہ کر رہی ہے۔ یہ ایک ایسا بسیط اور ظاہر مسئلہ ہے کہ جس کی توضیح کی حاجت اور اثبات و استدلال کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط رسّا جس سے آپ بڑے سے بڑے ہاتھی کو باندھ سکتے ہیں اور قوی سے قوی جہاز کا لنگر ڈال کر اس کو روک سکتے ہیں اگر اس کے دھاگے بکھیر دیے جائیں تو چند منٹ میں ایک ذرا سا بچہ اس کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔

نااتفاقی کی نحوست

ہماری سابقہ نااتفاقیوں کی نحوستیں ہم کو ہی ان جملہ مصائب میں فقط پھنسانے والی نہیں بلکہ دوسری مشرقی قوموں کی آزادی بھی سلب

کرنے والی ہیں اور انھیں نحوستوں کا ثمرہ یہ بھی ہے کہ آج ہندوستان کی قومیں ہندوستان میں نہیں بلکہ تمام ملکوں میں نہایت ذلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور مجمع اقوام میں سب سے زیادہ کمزور اور بے حمیت ثابت ہوئی ہیں۔ کوئی قوم ایشیائی یا افریقی ایسی نہیں کہ جنھوں نے رابطۂ اتحاد و مودت کے لیے اب اپنے دلوں میں ہندوستان کو جگہ دینا گوارا کر رکھا ہو۔ بہت سی یورپین اقوام بھی مثل دیگر اقوام کے نہایت بُغض و غضب کی نظر سے ہند کی طرف دیکھ رہی ہیں۔

دوسرا امر جو کہ باعث ان جملہ مصائب و شدائد کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ وہ موالات ہے جس کو تعلقاتِ دوستی اور تناصر سے تعبیہ کیا جاتا ہے اور کبھی اس کو شرکتِ عمل وغیرہ سے بھی یاد کیا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جملہ اُن بستیوں پر یہ امر واضح ہے جنھوں نے تواریخ عالم پر نظر ڈالی ہے کہ ہندوستان کی آزادی سلب ہونے اور اس کی ہر طرح مذلتوں میں گر جانے کا اصلی راز یہی ہے۔ ہندوستانی نفوس نے ابتدا سے ہمیشہ گورنمنٹ کو ہر قسم کی مدد پہنچا کر وفاداری اور نمک حلالی کا دم بھرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی اور دوسری قوموں کو بھی ہلاک کیا اور اسی وجہ سے برطانیہ روز افزوں قیدیں اور سخت سے سخت قانون نکالتی ہوئی مذہبی اور سیاسی جملہ آزادیاں سلب کر رہی ہے اور زندگانی کے تصوّر و مخلّات کو ڈھاتی ہوئی عدم کے مقبروں میں ہم کو دفن کرتی جا رہی ہے۔ تعجب ہے کہ جو قوم ہمارے نمک سے آج پرورش پا رہی اور پھر ہماری نمک حرامی کرتے ہوئے ہر طرح سے ہم کو قعرِ مذلّت میں ڈال رہی ہے۔ اس کی بھی نمک حرامی حرام ہو۔ حالانکہ وہ نمک بھی ہمارا ہی ہے۔ افسوس!! افسوس افسوس۔

انوار مدینہ میں اشتہار دیکر تجارت کو فروغ دیجیے۔

فی مدح الشیخین الجلیلین

المفتی محمود و غلام غوث الہزاروی

والرد علی من نقم منہم

بقلم الاستاذ العلام مولانا عبدالمنان الدہلوی

ترجمہ: حضرت مولانا محمد ظہور الحق صاحب مدظلہم مدرس جامعہ مدنیہ لاہور

أَلَا يَا أَيُّهَا الْعَاتِي بِأَنْوَاعٍ وَّأَشْتَاتٍ

اے مختلف طریقوں سے سرکشی کرنے والے (بدقسمت شخص!)

تَسُبُّ وَتَشْنَعُ الْعُلَمَاءَ وَيْلَكَ مِنْ خُرَافَاتٍ

تو علماءِ کرام کو گالیاں دیتا ہے، تیرے (ان) خرافات پر افسوس

تُرِيدُ هَوَانَهُمْ وَاللهُ يَرْفَعُهُمْ مَقَامَاتٍ

تو علماء کی رسوائی کے درپے ہے اور (حالانکہ) اللہ تعالیٰ ان کے مقامات کو بلند فرما رہا ہے

هَجَوْتَ إِمَامَنَا الْمَحْمُودَ مَمْدُوحَ الْكَمَالَاتِ

تُو نے ہمارے پیشوا اور کمالات سے متصف مفتی محمود کی ہجو کی ہے

زِمَامُ الْحَقِّ فِي يَدِهِ وَوِجْهَتُهُ إِلَى الذَّاتِ

جن کے ہاتھ میں حق کی باگ ہے اور جن کی توجہ ذاتِ حق کی طرف ہے

أَبُو اللَّيْثِ السَّمَرْقَنْدِي بِأَحْكَامٍ وَّعِلَّاتٍ

جو تفقہ میں اپنے زمانہ کے ابواللیث السمرقندی ہیں

فَقَاهَتُهُ مُسَلَّمَةٌ مُوَثَّقَةُ الشَّهَادَاتِ

جن کی فقاہت مسلم ہے اور شہادتوں سے مدلل ہے

خَطِيبٌ مُصْقِعٌ يَدْعُو إِلَى بِرٍّ وَّطَاعَاتِ

خطیب دلنواز ہیں (اور لوگوں کو) نیکی اور اطاعت خداوندی کی طرف بُلاتے ہیں

يُرِيْكَ خِطَابُهٗ بَحْرًا خَضَمًّا فِي الدُّرُوْسَاتِ

درس و تدریس کے وقت ان کا خطاب علم کا ایک بیکراں سمندر ہوتا ہے

خِطَابٌ رَائِعٌ يُبْدِي نِكَاتٍ نُوْرِ مِشْكَاتِ

ان کا پُر رونق خطاب مشکاتِ نبوت کے نکات کو ظاہر کرتا ہے

يَحِلُّ رُمُوْزَ مَمْلَكَةٍ وَيَكْشِفُ عَنْ خَبِيْئَاتِ

(اور جن کا سیاست میں یہ حال ہے کہ) مملکت کے رموز اور بھید کھولتے ہیں

يَرُوْعُ النَّاسَ مَنْطِقُهٗ وَنَادِرَةُ الْبَيَانَاتِ

اور ان کی نادر گفتگو لوگوں کے دلوں میں خوفِ الٰہی پیدا کرتی ہے

كَذَا الْأُسْتَاذُ مَوْلَانَا هِزَبْرٌ لَيْثُ غَابَاتِ

اسی طرح ہمارے استاذ (مولانا غلام غوث ہزاروی) (جرأت و شجاعت میں) جنگل کے قوی شیر (کی طرح) ہیں

عَلَى الْأَعْدَاءِ ضَرْبَتُهٗ وَكَمْ كَمْ مِنْ دَمَارَاتِ

جن کا وار دشمنوں پر تباہیوں پر تباہیاں ڈھاتا ہے

شُجَاعٌ لَّا يَخَافُهٗ جَبَابِرَةُ الزَّمَانَاتِ

وہ ایسے دلیر ہیں کہ جابر بادشاہ بھی ان کو نہیں ڈرا سکتے

وَاِنَّ الْمَوْتَ بُغْيَتُهٗ إِذَا مَا شَنَّ غَارَاتِ

وہ موت کے مشتاق رہتے ہیں جب تیروں کی بارش ہو رہی ہو

وَجُوْلَتُهٗ لِأَمْرِ الدِّيْنِ اَيَّامًا وَلَيْلَاتِ

اور جن کی رات دن کی دوڑ دھوپ فقط دین کے لیے ہے

غُلَامُ غَوْثٍ مِسْكِيْنٌ فَيَكْشِفُ عَنْ مُلِمَّاتِ

جن کا نامِ نامی غلام غوث ہے۔ مسکین صفت ہیں۔ اور مشکلات کے کھولنے والے ہیں

وَيَدْعُوْ رَبَّهٗ لَيْلًا وَيُهْرِيْقُ الدُّمُوْعَاتِ

جو اپنے رب کو رات کے وقت پکارتے ہیں اور جو خشیت باری کی وجہ سے آنسو بہاتے ہیں

قَنُوْعٌ صَابِرٌ يَرْضٰى وَيَقْنَعُ بِاللُّقَيْمَاتِ

قانع ہیں صابر ہیں اور چند ہی لقموں پر راضی رہنے والے ہیں

وَهِمَّتُهٗ رِضَى الْمَوْلٰى فَيَبْذُلُ فِيْهِ هِمَّاتِ

ان کا مطلوب و مقصود محض رضائے الٰہی ہے۔ اس مقصد کے حصول میں وہ اپنی تمام قوتیں صرف کرتے ہیں

جَزَاهُ اللّٰهُ يَرْفَعُهٗ قَبُوْلًا حَسْبَ خِدْمَاتِ

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات (دینیہ) کے مطابق ان کو بدلہ دے

وَيُدْخِلُهٗ كَمَا يَشْتَاقُ أَنْهَارًا وَجَنَّاتِ

اور انہیں ان کی حسبِ منشاء جنتوں میں داخل فرمائے

وَأَخْزٰى مَنْ يُخَالِفُهٗ

اور ان کے مخالفین کو لاجواب و

بِتَبْكِيْتٍ وَإِسْكَاتِ

ساکت کرکے رسوا و خوار کرے

انوار مدینہ

نہ پہنچنے یا تاخیر سے پہنچنے کی شکایت "جناب محترم عطاء اللہ خاں صاحب منیجر انوار مدینہ" جامعہ مدنیہ لاہور سے کی جائے اور ہر خط میں خریداری نمبر اور اپنا پتہ صاف الفاظ میں ضرور تحریر کیا جائے ——— (ادارہ)

دورِ حاضر کے

سیاسی اور اقتصادی مسائل

اور

اسلامی تعلیمات و اشارات

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سید محمد میاں دامت برکاتہم

انفرادی ملک کی ضرورت

امانت یا عاریت کو ملک کی حیثیت کیوں دی جاتی ہے

گائے بیل وغیرہ جتنے بھی جانور ہیں ان کے سامنے صرف پیٹ بھرنے یعنی بقاءِ حیات کا مسئلہ ہے۔ قدرت ان کی رہنمائی کرتی ہے اور یہ جانور قدرتی ذخیروں سے پیٹ بھر لیتے ہیں۔ یہاں ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر انسان کے سامنے بھی صرف بقاءِ حیات کا مسئلہ ہوتا تو قطعاً ضرورت نہیں تھی کہ انسان کے حق میں ملک، ملک کی حیثیت اور اس کی ضرورت پر بحث کی جاتی۔ لیکن انسان کے سامنے پیٹ سے پہلے خود انسانیت کا مسئلہ ہے۔ انسان ہے تو لامحالہ اس میں انسانیت ہونی چاہیے۔ انسانیت کیا ہے؟ انسانیت کیسے پیدا کی جائے؟ ان مسائل کو اگر پیٹ کے مسئلہ سے مقدم نہ رکھا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق نہ رہے۔

مسئلہ انسانیت اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک قدرت کی پیدا کردہ چیزوں پر قدرت کی طرف سے افراد انسان کے لیے ایسے تصرفات کا حق نہ تسلیم کیا جائے، جن کو مالکانہ تصرفات اور مالکانہ اختیارات کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان سماج چاہتا ہے اور سماج یا معاشرہ ہی ایسی خصوصیت ہے جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور تعمیر و تمدن اور ترقی کی بنیاد بنتی ہے۔ انسانیت ایسی خصوصیتوں

اور خصلتوں کا نام ہے، جن سے معاشرہ اور سماج میں خوبی اور عمدگی پیدا ہو، جن کے ذریعہ ایک انسان بہترین سماج کا معمار بن سکے۔ ورنہ کم از کم کسی باعزت اور شریف سوسائٹی کا رکن بن سکے۔

معاشرہ اور سماج کے لیے باہمی رابطہ تعاون اور امن بنیادی شرط ہے۔ ان شرطوں کے بغیر سماج کا وجود ہی نہیں ہو سکتا اور اگر بالفرض وجود ہو جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا اور اچھا سماج وہ ہے جس کے افراد کا باہمی رابطہ انسیت اور محبت کے رشتہ میں جکڑا ہوا ہو، ہمدردی کی پیچ اس رشتہ کے اندر سرایت کیے ہوئے ہو، رحم اور شفقت کے پودے لگے ہوئے ہوں جو بڑھ چڑھ کر سماج کو انسانیت و شرافت کا گلشن بنا رہے ہیں۔

اسبابِ محبّت

محبّت روحانی تعلیم سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ماں باپ کی محبت فطری ہوتی ہے۔ لیکن سماج اور معاشرہ کا ہر ایک فرد دوسرے کا ماں باپ نہیں ہوتا، اس میں برابر کے بھائی بہن بھی ہوتے ہیں اور ایسے اجنبی بھی ہوتے ہیں جن سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ یا اگر ہوتا ہے تو بہت دور کا۔ روحانی تربیت بھی ہر ایک کا حصّہ نہیں ہے۔

حُسن کا چرچا بہت ہے جس کے لیے عشق و محبّت کا سرمایا لٹایا جاتا ہے۔ مگر اس پر متاعِ جان قربان کرنے والے بہت کم ہیں۔ حضراتِ شعراء کو دنیاءِ شعر میں صرف ایک ہی مجنون ملا ہے۔ مگر اس کا بھی حسب نسب معلوم نہیں اور نہ یہ معلوم کہ کس ملک کا رہنے والا تھا۔ لفظ مجنون عربی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحرائے عرب کا ہو گا۔

بہرحال مخصوص صورتوں میں اور نادر مثالوں کو چھوڑ کر عام بات یہی ہے کہ محبّت اور انسیت ثمرہ ہوتا ہے احسان کا، نتیجہ ہوتا ہے لطف و کرم کا، ایثار اور قربانی کا۔ داد و دہش اور سخاوت کے پودوں پر محبّت کے پھُول کھلا کرتے ہیں۔ ہدیہ اور تحفہ کی ڈالیوں پر عنایت و شفقت کے غنچے چٹخا کرتے ہیں۔ لیکن یہ اسباب محبّت جب ہی وجود میں آ سکتے ہیں۔ اور معاشرہ و سماج وجود پذیر ہو کر بہتر جب ہی بن سکتا ہے جب افراد کو مالکانہ اختیارات حاصل ہوں۔ اور جن چیزوں کو قدرت کی امانت کہا گیا ہے۔ وہ ان افراد کے لیے مملوک کی حیثیت رکھیں۔ سخاوت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے پاس کچھ ہو۔ تب ہی کسی پر احسان ہو سکیگا۔ تب ہی ایثار اور قربانی کی حقیقت کھل کر سامنے آئیگی کہ آپ ضرورتمند

کی ضرورت کو مقدم رکھتے ہیں یا اپنے بنک بیلنس کی خیر مناتے ہیں۔

اسلام ایک خاص قسم کا سماج رونما کرنا چاہتا ہے۔ قرآن شریف کی ہدایت اور تعلیم کے بموجب اس کے افراد ایسے ہونے چاہئیں:

جو خرچ کرتے رہتے ہوں خوشی میں اور تکلیف میں۔ جو دبا لیتے ہوں غصہ اور معاف کرتے ہوں لوگوں کو۔ (سورۂ آل عمران، آیت: ۱۳۴)

جو نماز کو پوری شان کے ساتھ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر (ہر طرح) خرچ کرتے رہیں۔ (سورۂ رعد، آیت: ۲۲)

جو یتیم، مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں، ایسی حالت میں کہ جب کھانا خود ان کو محبوب ہو۔ (وہ خود ضرورتمند ہوں اور نیت یہ ہو کہ) ہم صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ تم سے (بھوکوں اور ضرورتمندوں سے) نہ اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ (سورۂ دہر، آیت: ۹)

جن کی کروٹیں اوقاتِ شب میں بستروں سے جدا رہیں۔ خدا کا خوف رکھتے ہوئے اس کی رحمت کی امید لگاتے ہوئے اپنے رب کو یاد کرتے رہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہیں۔ (سورۂ سجدہ، آیت: ۱۶)

جو رات کو بہت کم سوئیں اوقاتِ سحر میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں جن کے مالوں میں سائل کا بھی حق ہو اور اس کا بھی جو محروم ہے (مگر سوال نہیں کرتا)

(سورۂ ذاریات، آیات: ۱۷، ۱۸، ۱۹)

جو خدا کے عہد کو پورا کریں۔ اس کو توڑیں نہیں۔ اور ان سے جوڑے رکھیں جن سے جوڑنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ جو اپنے رب سے ڈرتے رہیں اور اندیشہ رکھیں بُرے حساب کا۔ جو اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔ (سورۂ رعد)

جو پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس کی برائی پھیل پڑے گی۔ (دہر، آیت: ۷)

برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہوں۔ (سورۂ رعد آیت ۲۲)

جو کام کریں آپس کے مشورے سے اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(سورۂ شوریٰ، آیت: ۳۸)

جو صبر کرنیوالے سچے ہوں، حکم بجا لانیوالے، خرچ کرنے والے اور گناہ بخشوانے والے پچھلی رات (اوقاتِ سحر) میں۔ (سورۂ آلِ عمران، آیت: ۱۷)

اس طرح کا معاشرہ اور سماج ہر ایک اصلاحی تحریک کا مقصد اور نصب العین ہونا چاہیے لیکن اس طرح کے سماج کی تشکیل و تخلیق میں جو چیز بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے وہ انفاق ہے۔ یعنی اپنی دولت کو خرچ کرنا۔

احسان اور لطف و کرم جب ہی ہوتا ہے جب کوئی اپنی جیب سے خرچ کرے۔ یہی خرچ دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ اپنی ضرورت کو پیچھے ڈال کر جب دوسرے کی ضرورت مقدم سمجھی جائے گی اور اس پر عمل کیا جائے گا۔ تو اس کا ثمرہ جذبۂ شکر گزاری ہوگا۔ جو شکر گزار کو جاں نثار بھی بنا سکتا ہے اور اس کا اثر وہ نظم و ضبط بھی ہوگا جو جذبۂ جاں نثاری کے نتیجے میں پیدا ہو سکتا ہے کہ احسان کرنیوالا قدرتی طور پر فرماں روا بن جاتا ہے جس کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے: لِيَتَّخِذَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا۔ (زخرف)

تسخیر کا بہترین عمل احسان ہے خصوصاً وہ احسان جس میں ایثار بھی ہو: "الانسان عبد الاحسان"

(۲)

اگر اخلاق کی دنیا میں ایسا انقلاب آجائے کہ بخل، حرص، طمع انسانیت کے جوہر مانے جائیں۔ کمزور کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا دانشمندی، کاروباری مکر و فریب، جھوٹا پراپیگنڈہ اور نمایش فنی کمالات سمجھے جائیں۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور شاطرانہ چالوں سے استحصال پر فخر کیا جائے۔ خود غرضی اور زر پرستی کو مذہب اور دھرم بنا لیا جائے تو اس سے پہلے کہ ہمارے دلائل کے قلعے مسمار ہوں ہم خود ہی بحث کا دروازہ بند کر دیں گے۔

لیکن اگر انسانیت اور شرافت کا اتنا وجود اور نمود باقی ہے کہ گرتے کو سنبھالنا، کمزور کی مدد کرنا۔

بے لوث اور بے غرض ہو کر کام کرنا۔ دوسرے کے فائدے کے لیے اپنے فائدہ کو پیچھے ڈال دینا۔ سیر چشمی، سخاوت، فراخ حوصلگی، معاملہ کی صفائی، سچائی، دیانت داری جیسے اوصاف و خصائل انسانیت کے جوہر اور انسان کے کمالات مانے جاتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی ملکیت کو ختم کر دیا جائے تو کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ کمالات ظاہر ہوں اور انسانیت و شرافت کا سر بلند ہو؟

بے شک انفرادی ملکیت ختم ہونے سے چند خرابیاں ختم ہو جائیں گی۔ مثلاً: چور بازاری، ملاوٹ اور جھوٹے پراپیگنڈے کا موقع نہیں رہیگا۔ مگر اس خوبی کے ساتھ پہلی خرابی یہ ہے کہ چور بازاری وغیرہ کا عمل اگرچہ ختم ہو جائے گا، مگر وہ جذبہ جو چور بازاری یا ملاوٹ وغیرہ کا (محرک) ہوتا ہے ختم نہ ہوگا اور ممکن ہے وہ اپنی تسکین کے لیے کوئی دوسری راہ نکال لے۔ جو اس سے زیادہ شرمناک اور پُرخطر ہو۔

دوسری خرابی یہ کہ وہ پاک جذبات جو مکارم اخلاق یعنی رحم و کرم اور صداقت و دیانت کا سبب اور محرک ہوا کرتے ہیں وہ افسردہ ہو کر بے نام و نشان ہو جائیں گے اور انسانیت ہم پلّہ حیوانیت بن کر رہ جائے گی۔

(۳)

ہمیں حُرّیت اور آزادی کا بھی تجزیہ کرنا ہے، جو انسان کا پیدائشی حق ہے اور جس کے لیے ہر قربانی نہ صرف صحیح بلکہ لازم اور واجب مانی جاتی ہے۔

جمہوریت کو عمل اور تجزیہ کی کسوٹی پر کسا گیا تو یہ ناقابلِ انکار حقیقت سامنے آئی کہ خود اپنی رائے اور ووٹ سے اپنے معاملات کی تکمیل کو چند افراد کے ہاتھ میں دیدینے کا نام جمہوریت ہے۔ جمہوریت کو اگر جال کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا اگرچہ اس جال کے بُننے والے جمہور ہی ہوتے ہیں اور وہی اس جال کی رسّی چند افراد کے حوالے کرتے ہیں۔ یہ جال بُرا نہیں بہت اچھا ہے بشرطیکہ یہ ذمہ دار افراد سچائی اور دیانت داری کے ساتھ دستور کی پابندی کریں اور صحیح معنٰی میں اپنے آپ کو جواب دہ سمجھیں۔ لیکن اگر انفرادی ملکیت کو بھی اس جال کی ڈوریوں میں لپیٹ دیا جائے تو پھر دیکھنا ہوگا کہ

فرد کی حیثیت با اختیار اور آزاد رہتی ہے یا فرد ایک مشین کا پرزہ بن جاتا ہے۔ جو "مشین مین" کے اشاروں پر گردش کے لیے مجبور ہوجاتا ہے اور حریت فکر یا شخصی آزادی تو درکنار ہوش وحواس سے بھی محروم ہوجاتا ہے ؎

حلقۂ در گردنم افگندہ دوست　　مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اِنِ الحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

ترجمہ: فیصلہ صرف اللہ کا۔　(سورۃ انعام، آیت: ۵۷)

یہی وہ ممتاز مقام اور وہ حد فاصل ہے، جو اسلام کے مالی نظام کو ایک طرف کیپیٹلزم اور سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسری طرف کمیونزم، اشتراکیت اور اشتمالیت سے جدا کرتی ہے ؎

در کفِ جامِ شریعت در کفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن!

اسلام فرد کو ملکیت عطا کرتا ہے۔ مگر یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی وقت بھی فرد اس حقیقت کو فراموش کردے کہ یہ ملک درحقیقت امانت ہے۔ جس کو ملکیت کی تعبیر مستعار دے دی گئی ہے۔

اسلام دولت کی تقسیم خود کرتا ہے۔ تقسیم کے بعد فرد کو جو کچھ دیتا ہے وہ بھی اس شرط پر کہ باقی ماندہ میں بھی اس کو فیصلۂ خداوندی کی تعمیل کرنی ہوگی۔

اسلام نے فیصلہ کے اصول مقرر کردیے ہیں جن کے ماتحت تفصیلات مرتب کرنا اور ان کو نافذ کرنا اس نظام کے حوالہ ہوتا ہے۔ جس کو خلافت کہا جاتا ہے۔ جو ایک طرف حاکم علی الاطلاق یعنی خداوندِ عالم کی نیابت ہوتی ہے کہ وہ ذمہ داریاں پوری کرے جو رب العالمین نے اپنی مخلوق کے بارے میں اپنے اوپر لی ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ ـــ اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر اس کی روزی ہے۔　(سورۃ ھود)

دوسری طرف وہ بندگانِ خدا کی نیابت ہوتی ہے، تاکہ وہ خدمات انجام پا سکیں جن کے لیے جماعتی

طاقت اور فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

خلیفہ صرف مخلوق کے سامنے نہیں بلکہ خالق کے سامنے بھی جواب دہ ہے۔ اور اسی لیے وہ پابند ہے کہ جس طرح مخلوق کے معاملات میں وہ شوریٰ سے مشورہ کرے اسی طرح وہ خالق کے عطا کردہ قانون اور دستور کے منشار کو سمجھنے میں شوریٰ سے مدد حاصل کرے۔

خلیفہ کے فرائض اور شرائط وغیرہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ البتہ وہ جس طرح دولت کی تقسیم کرے گا اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

سرمایہ داری

ایک مسلمان سرمایہ دار نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دار اپنی دولت کو خالصتاً اپنی ملک اور ایسی ملک سمجھتا ہے جس کا وہ پوری طرح مالک ہے۔ اور اس کو من مانی کرنے کا پورا اختیار ہے۔ لیکن ایک مسلمان جس ایمان کی بنیاد پر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ اپنی دولت کا مالکِ حقیقی خود نہیں بلکہ خدا کو قرار دیتا ہے اور اس بنا پر صاحبِ ایمان مسلمان پابند ہوتا ہے کہ دولت کو حاصل کرنے میں بھی مالک کی مرضی پر عمل کرے۔ اس کی اجازت کو شرطِ اول سمجھے اس کو اپنے پاس اور اپنے قبضے میں رکھنے میں بھی اس کے احکام کا پابند رہے۔ پھر خرچ بھی مالکِ حقیقی کے مقرر کردہ اصول کے مطابق کرے۔

اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی حیثیت سے اس دولت کا مالک بھی تھا تو ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے نہ صرف اپنی دولت بلکہ خود اپنی جان بھی خدا کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی جان اور اس کا مال سب کچھ خرید لیا ہے۔ (سورۃ توبہ، آیت: ۱۱۰)

اسلام اور شاہنشاہیّت سے نفرت

تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی بات ہے ایک نبی اور ایک بادشاہ کا مقابلہ تھا۔ بادشاہ نے اہلِ ملک کو چند طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بادشاہ کی قوم جاگیردار تھی۔ جس نے نبی کی قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ غلام قوم سے مویشی کی طرح کام لیتی تھی بلکہ اس کی نسل کو بھی خاص حد میں محدود رکھتی

تھی کہ تعداد کی زیادتی سے بھی سرکشی کا خطرہ تھا۔ وہ برتھ کنٹرول کے جھمیلے میں نہیں پڑتی تھی بلکہ جب ضرورت سمجھتی لڑکوں کو ذبح کرا دیتی تھی۔ صرف لڑکیوں کو باقی رکھتی تھی۔ کیونکہ ان سے یہ خطرہ نہیں تھا۔ اور گھریلو خدمت کے لیے بھی ان کی ضرورت تھی۔ (سورۂ قصص، آیت: ۴)

نبی کا مطالبہ تھا کہ غلام قوم کو انسانی زندگی کا موقع دیا جائے اس کے اوپر سے پابندیاں ہٹائی جائیں۔ تاکہ نبی اپنی قوم کو جہاں چاہے لیجائے۔ مگر بادشاہ اور اس کی قوم اس کے لیے تیار نہیں تھی کہ پشت ہا پشت کی غلام قوم کو آزاد کر کے اپنے جاگیردارانہ مفادات کو ختم کر دے۔

یہ کشمکش جاری تھی کہ بادشاہ نے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی قوم کے سامنے یہ سوال رکھا:

"کیا مصر کے ملک اور یہ نہریں جو اس ملک میں بہہ رہی ہیں میری نہیں ہیں اور میں بہتر ہوں یا یہ گھٹیا درجہ کا آدمی جو اپنے آپ کو خدا کا بھیجا ہوا نبی کہتا ہے؟ مگر اس کے پاس عظمت اور قیادت کا کوئی نشان نہیں ہے۔ نہ ہاتھوں میں سونے کے کنگن ہیں (جو سرداروں کا مخصوص نشان ہوتے ہیں)۔ جس خدا نے اس کو ید بیضا کا معجزہ دیا ہے، اس نے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیے، اور ایسا کیوں نہیں کیا کہ فرشتوں کا ایک دستہ اس کے حوالے کر دیتا جو اس کے جلو میں رہتا۔ (خلاصہ آیات: ۵۱ تا ۵۳ سورۂ زخرف)

دیوتاؤں کو پوجنے والی بادشاہ کی قوم نے نہ صرف یہ کہ اس کو ملک کا مالک مانا بلکہ اس نے سب کو جمع کر کے یہ اعلان کیا کہ "میں تمہارا سب سے بڑا دیوتا "رب اعلیٰ" ہوں"۔ (نازعات، آیت ۲۳/۲۴)

تو اس کے جواب میں بھی گردنیں جھکا دیں اور آستانۂ ملوکیت پر پیشانیاں ٹیک دیں۔

نبی اس قوم کو خدا پرست بنانا چاہتا تھا مگر قوم کی مفاد پرستی نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس نے نبی سے بغاوت کی اور شاہ پرست و مفاد پرست بنی رہی۔ نبی اور بادشاہ کی طویل کش مکش کا آخری نتیجہ قرآن پاک کے الفاظ میں یہ ہوا۔

فاغرقناھم تا للاخرین۔ (سورۂ زخرف، آیت: ۵۵/۵۶)

خلاصہ یہ کہ ہم نے ان سب کو ڈبو دیا۔ یہ قوم (اپنی ہستی کے لحاظ سے) رفتہ و گزشتہ اور

داستان پارینہ رہ گئی (مگر) بعد میں آنے والوں کے لیے ایک مثال (اور درس عبرت) بن گئی۔

اس مثال نے جہاں اور باتیں بتائیں۔ ملوکیت کے معنی اور اس کی خصوصیات کی بھی نشاندہی کردی۔

ملک، بادشاہ، اپنے آپ کو مالکِ ملک اور اپنی اولاد کو وارثِ ملک سمجھتا ہے۔ بادشاہت اس کا نصب العین ہوتا ہے اس کے لیے وہ ہر ایک ظلم کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ انسانوں کے گروہ میں پھوٹ ڈال کر ان کو پارٹیوں میں بھی بانٹ دیتا ہے اور جب ضرورت سمجھتا ہے۔ انسانوں کے جگر پاروں کو ذبح کرنے اور موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

وہ انسانوں کی گردنیں جھکانے کو کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ان کے دل جھکیں اور اس کی بادشاہت کو وہ اپنا عقیدہ بنالیں۔ اور بہت اچھا ہو کہ وہ اس کو اپنا معبود بنالیں۔ اور دیوتا سمجھنے لگیں۔ وہ کسی دستور کی پابندی کو کسر شان سمجھتا ہے، بلکہ خود اس کا منشاء دستور اور اس کی زبان اس کا قانون ہوتا ہے یہ ہے "ملوکیتِ کاملہ" جس کو فرعونیت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، ملوکیت کے اس تجزیے کے بعد کتاب اللہ کی آیات بینات پر نظر ڈالو وہ کس طرح اس کے ہر ایک جزو کی تردید کر رہی ہیں ایک جگہ نہیں بلکہ بار بار یہ مضمون دہرایا گیا ہے۔

زمین و آسمان کا مالک اللہ ہے۔ جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے وہ سب اللہ کا ہے۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰۷، آل عمران، آیت: ۱۸۹۔ مائدہ، آیت: ۱۷ و ۳۹ وغیرہ۔ اعراف، زخرف، زمر، وغیرہ)

وہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۴۷)

ایک مسلمان جس طرح کلمہ شہادت ادا کرتا ہے اسی طرح قرآن پاک ایک مسلمان سے یہ کہلواتا ہے:

(۱) اے اللہ! اے مالکِ ملک! تو ہی جس کو چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے۔ جس سے چاہتا ہے ملک نکال لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ (آل عمران، آیت: ۲۶)

(۲) وارثِ ملک بادشاہ یا بادشاہ زادہ نہیں، بلکہ زمین اور اس سب کا جو زمین کے اوپر ہے وارث اللہ تعالیٰ ہے۔ (سورۂ مریم، آیت: ۴۰)

سب آسمان اور ساری زمین اللہ کی میراث ہے۔ (آل عمران، آیت: ۱۸۰)

بلاشبہ زمین اللہ ہی کے لیے ہے ۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے ۔ (سورۂ اعراف، آیت : ۱۲۸)

(۳) حکومت اور قیادت کی جس میں قدرتی صلاحیت ہو وہی اس کا اہل ہوتا ہے اگرچہ مال و دولت اور دنیوی عزّت وجاہ سے خالی ہو۔ (سورۂ بقرہ، آیت : ۲۴)

صلاحیت کے لیے اصل چیز علم اور جسم کی قوّت ہے یعنی دماغی اور جسمانی قابلیت، نہ کہ مال و دولت اور نسل و خاندان کا شرف ۔ (سورۂ بقرہ، آیت : ۲۴۷)

(۴) یہ صرف فطرت کی کارفرمائی ہے کہ اس نے نوعِ انسان کو قدرت اور اختیار کے ساتھ زمین میں بسایا، آباد کیا۔ اور اس کی زندگی کے سروسامان مہیا کیے ۔ (اعراف، خلاصہ آیت : ۹)

(۵) اور اسی نے تم کو (نوعِ انسان کو) بنایا نائب زمین میں ۔ (الانعام، آیت : ۱۶۵)

وہی ہے جس نے بنایا تم کو قائم مقام زمین میں ۔' (سورۂ فاطر، آیت : ۳۹)

مختصر یہ کہ اسلام حکومت اور بادشاہت کو برداشت تو کیا کرتا، ملوکیت کے نام سے بھی اس کو نفرت ہے ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : اخنع الاسماء عند اللہ رجل یسمی ملک الاملاک — (بخاری شریف : ۹۱۶)

البتہ وہ انسان کو خلیفہ، نائب اور قائم مقام قرار دیتا ہے ۔ انبیاء علیہم السّلام کے بعد اللہ کا خلیفہ وہ ہے جس کو اللہ کے ماننے والے، خدا پرستی، خدا شناسی اور خدا ترسی (تقویٰ) کی بنیاد پر اپنا سربراہ بنائیں ۔ اس کے مشیر وہ ہوں گے جو بہتر اخلاق و کردار اور قانونِ خداوندی کی پابندی (تقویٰ) کے معیار پر پورے اترتے ہوں اور خدا پرستی کے نمونے ہوں ۔ اس ہیئت حاکمہ کو خلافت کہا جاتا ہے ۔ اس کے سامنے خدا کا دیا ہوا دستورِ اساسی ہوتا ہے جس کی روشنی میں سربراہِ خلافت فیصلہ کرتا ہے ۔

بیسویں صدی کی جدت یہ ہے کہ اس کو حکومتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے ۔ مگر لسانِ نبوت علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام نے اس کے لیے لفظ خلافت عطا کیا تھا۔ حضراتِ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

نے اسی عنوان کو اختیار کیا۔ قرآن شریف میں ایسے سربراہ کو خلیفہ فرمایا گیا۔ (سورۂ ص وغیرہ)
حکومت الٰہیہ کا لفظ بے محل اور غیر موزوں بھی ہے اور خلافِ احتیاط بھی۔ خوارج کا ذوق و شوق یہ تھا کہ اگر ان کو حکومت قائم کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس کو حکومت الٰہیہ کہتے کیونکہ اِنِ الحکم الّا للہ انہیں کا نعرہ تھا، جس کے متعلق حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فیصلہ یہ تھا:

الکلمۃ حق ارید بہا الباطل ——— بات ٹھیک ہے مطلب غلط لیا گیا ہے۔

خلیفہ ایک طرف مالک الملک کا نائب ہوگا کہ اس کے دستور و قانون کو نافذ کرے گا دوسری جانب وہ خدا پرستوں کا نمایندہ ہوگا۔ یعنی وہ اکائی ہوگا جس پہ پوری ملّت میں پھیلی ہوئی نظامِ ملّت کی شاخیں جُڑ جائیں گی۔ اور اس طرح کثرت میں وحدت پیدا ہو جائیگی۔ توحید کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پھیلا ہوا نظام ایک ہوتا رہے۔ جو پہلے خلیفۃ اللہ پہ پھر مالک حقیقی پر جا کر اکائی بن جائے۔ (ان صلاتی ونسکی تا اوّل المسلمین۔)

حضرت موسٰی علیہ السّلام اور فرعون علیہ ما علیہ مضمون کے آغاز میں ایک نبی کا حوالہ دیا گیا تھا یہ نبی حضرت موسٰی علیہ السّلام تھے اور بادشاہ کا نام منفتاح تھا۔ (قصص القرآن) مگر اس زمانہ میں شاہ مصر کو فرعون کہا جاتا تھا۔ قرآن حکیم نے نام کے بجائے "خطاب" کو استعمال کیا ہے۔ یہ حسن ادب کی تعلیم ہے کہ بدترین مخالف کے لیے بھی وہ لفظ استعمال کیا جو اس کے اور اس کی قوم کے محاورات میں سب سے زیادہ باعزّت نام تھا۔ اب ملک اور بادشاہ سے زیادہ فرعون اور فرعونیت سے نفرت، انسانی ذہن کا پیوند بن چکی ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اگر یہ نفرت ضروری ہے تو یہ قرآن حکیم کا طفیل ہے۔

سیّد حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع و ناشر نے مکتبہ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ انوار مدینہ جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔